ڈاکٹر محمود احمد غازی

کلامیاتِ سیرت

محترم جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی نے گزشتہ دنوں ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے زیر اہتمام فنِ سیرت اور علومِ سیرت کے حوالے سے بارہ خطبات دیئے۔ ذیل کا مضمون اسی سلسلۂ خطبات کے ایک خطبے پر مشتمل ہے۔ جسے کاغذ پر منتقل کر کے فاضل مقرر کی نظرِ ثانی کے بعد پیش کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

کلامیاتِ سیرت سے مراد وہ موضوعات ہیں، جو اصلاً علمِ کلام سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن سیرت کے واقعات اور حقائق سے ان کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ یا وہ واقعات ہیں، جو اصلاً سیرت سے تعلق رکھتے ہیں، مگر ان کے معانی و مطالب اور ان سے وابستہ بہت سے پہلو ایسے ہیں جو علمِ کلام سے تعلق رکھتے ہیں، اور علمِ کلام کے مباحث میں جائے بغیر ان کو سمجھنا دشوار ہے، ان مشترک موضوعات کو کلامیاتِ سیرت کا عنوان دیا جاسکتا ہے۔ جب سیرت نگاروں نے سیرت کی ترتیب و تدوین کا کام شروع کیا اور اس کا ایک مرحلہ مکمل ہوگیا، تو تقریباً دو سو سال کے وقفے کے بعد دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی ہجری کے اوائل میں مطالعۂ سیرت کی ایک نئی جہت سامنے آئی۔ جس کے دو اسباب تھے، ایک بڑا سبب تو یہ تھا کہ ان دنوں یونانی علوم وفنون کا بڑے پیمانے پر عربی زبان میں ترجمہ شروع ہوا۔ مسلمان اہل علم نے یونانی منطق، یونانی فلسفے اور دیگر یونانی علوم کا مطالعہ شروع کیا۔ اور بہت سے معاملات پر یونانی نقطۂ نظر، یونانی اسلوبِ تفکیر اور یونانی اندازِ استدلال سے غور وخوض کا سلسلہ شروع ہوا۔ اُنہی دنوں مسلمان دانش وروں کا ایک خاصا بڑا حصہ یونانی علوم وفنون بالخصوص منطق وفلسفے سے متاثر ہوا۔ اور اس طبقے کی طرف سے جس میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں شامل تھے، بہت سے ایسے سوالات اسلامی عقائد کے بارے میں اُٹھائے گئے، جن کا جواب یونانی اسلوبِ استدلال کو اختیار کیے بغیر دینا مشکل تھا۔ اس لئے علمائے اسلام نے یونانی منطق اور علوم وفنون سے واقفیت پیدا کی۔ اور ان کے اسلوب و استدلال کے مطابق اسلامی عقائد کو بیان کرنے اور اسلامی عقائد پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی۔

انہی دنوں ان حضرات نے جو سیرت نگاری کے مقدس کام سے وابستہ تھے، محسوس کیا کہ اب

وقت آ گیا ہے کہ سیرت کے عام تاریخی، فقہی اور قانونی پہلوؤں کے علاوہ ان پہلوؤں پر بھی غور کیا جائے جن کا تعلق عقائد اور علمِ کلام کے مسائل سے ہے۔ اس کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے دلائل اور شواہد پر جب غور وخوض کا آغاز ہوا اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور ان کے لائے ہوئے شواہد و دلائل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شواہد و دلائل کا مقابلہ کیا گیا تو یہ محسوس کیا گیا کہ اس مضمون کو زیادہ واضح اور مؤثر انداز میں بیان کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نبوت، رسالت اور وحی والہام پر خالص عقلی نقطۂ نظر سے بھی غور کیا جائے، اور ان لوگوں کے لئے عقلی دلائل مرتب کر دیئے جائیں جو محض قرآن وسنت کے دلائل کی بنیاد پر شرح صدور اور اطمینانِ قلبی محسوس نہیں کرتے۔ چنانچہ تیسری صدی ہجری کے اوائل سے لے کر آئندہ ایک طویل عرصے تک یہ مسائل سیرت کا ایک جزوی حصہ رہے ہیں۔ اور تقریباً ہر بڑے سیرت نگار نے ان مسائل پر گفتگو کی ہے۔ یعنی نبوت و رسالت کی حقیقت کیا ہے؟ نبی اور رسول میں فرق کیا ہے؟ نبی اور رسول کس کو کہتے ہیں؟ نبی اور رسول کا ذریعۂ علم کیا ہے؟ ذرائع علم کی کتنی قسمیں ہیں؟ وحی اور الہام میں کیا فرق ہے؟ وحی کا ماخذِ علم کیا ہے؟ پھر چونکہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام خاتم النبیین ہیں، اس لئے ختمِ نبوت کیا ہے؟ ختمِ نبوت کی حکمت اور فلسفہ کیا ہے؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خصائص اور امتیازی خصائص کیا ہیں؟ وہ امتیازی اوصاف جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عام انسانوں سے ممتاز کرتے ہوں، وہ خصائص اور امتیازی اوصاف جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے انبیائے کرام سے ممتاز کرتے ہوں کیا ہیں؟ اس پر باقاعدہ کتابیں لکھی گئیں۔ امتیازی اوصاف پر گفتگو سے معجزے پر گفتگو شروع ہوئی، معجزہ اور اُس کی حقیقت کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کون کون سے ہیں؟ انبیائے کرام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کے مابین کوئی جوہری فرق ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کیا ہے؟

معجزات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآنِ پاک ہے جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کی تصدیق اور دلیل کے طور پر پیش فرمایا۔ خود قرآنِ کریم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے معجزات کا تذکرہ ہے۔ جن میں سب سے بڑا اور سب سے اہم تذکرہ اسراء اور معراج کا ہے۔ اس موضوع پر مسلمانوں میں طویل عرصے سے غور وخوض کا عمل جاری ہے۔ معراج کے روحانی پہلوؤں پر بھی اکابرینِ اسلام نے لکھا ہے۔ اس کے کلامی اور فقہی پہلوؤں پر بھی لکھا گیا ہے۔ معراج کے ادبی پہلو پر ایک الگ سلسلۂ کتب ہے، جس میں برصغیر کا حصہ انتہائی غیر معمولی ہے۔

واقعۂ معراج اور روایتِ معراج سے متاثر ہو کر مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ غیر مسلموں میں بھی بہت سی کتب مرتب کی گئیں، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، لیکن یہ بات کہ کائنات کے مختلف حصوں کا روحانی اور تصوراتی سفر معراج کے واقعے سے متاثر ہو کر کیا جائے اور اس سفر کی داستان میں ادبی اور رمزیہ انداز میں مختلف حقائق کو بیان کیا جائے، یہ روایت مسلمانوں کی ادبی تاریخ میں مقبول رہی ہے۔ اس کا سب سے آخری اور برصغیر کا انتہائی ممتاز اور قابلِ فخر نمونہ علامہ اقبالؒ کی کتاب جاوید نامہ ہے، جس میں اُنہوں نے سیارگانِ فلک کا ایک روحانی اور تصوراتی سفر مولانا رومی جنہیں وہ پیرِ رومی کے لقب سے یاد کرتے ہیں، کی معیت میں کیا۔ مختلف تاریخی شخصیات سے جن میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل تھے، تصوراتی ملاقاتیں کیں۔ اُن کی زبان سے مختلف حقائق بیان فرمائے یوں وہ علامہ اقبالؒ کے فلسفے اور ادبیات کا انتہائی اعلیٰ اور منفرد نمونہ ہے، جو کلامیاتِ سیرت کا ایک ثمرہ اور اس کی ایک برکت ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص پر جب صوفیائے کرام نے غور کیا تو انہوں نے روحانیت کے ایک نئے پہلو کو جنم دیا۔ جس میں اُنہوں نے حقیقتِ محمدیہ، نورِ محمدی اور بہت سے انبیائے کرام کے نور اور نسبتوں پر اظہارِ خیال کیا۔ اور اپنے ذرائعِ علم سے کام لے کر مختلف انبیائے کرام علیہم السلام کا روحانی مقام اور نسبتیں متعین کیں، اور ان نسبتوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا واسطہ تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ، جس کو حقیقتِ محمدیہ کے نام سے بیان کیا گیا۔ بقیہ انبیائے کرام کی نسبتوں سے کیا رابطہ تھا؟ اس پر بہت سے صوفیائے کرام نے غور و خوض کیا۔ اس پر بڑی فاضلانہ تحریریں صوفیا نے لکھیں، جس میں ہمارے برصغیر کا حصہ بھی کم نہیں ہے، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے مکتوبات میں جابجا اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اور صوفیانہ زبان میں روحانی تجربات کے پس منظر میں حضور علیہ السلام کی روحانی عظمت اور اخلاقی برتری کو مجدد الف ثانیؒ نے نہایت نفیس اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔

نبوت اور متعلقاتِ نبوت پر شروع سے غور و خوض جاری ہے، کچھ حضرات نے نبوت کے مسئلے پر خالص عقلی انداز سے غور کیا ہے، اور فلسفے اور عقلیات کے میدان میں ایک نیا مضمون اور ایک نیا موضوع متعارف کرایا ہے۔ فارابی جو مسلمان مفکرین اور فلاسفہ میں نہایت اونچا مقام رکھتا ہے، وہ اتنے اونچے مرتبے کا حامل ہے کہ مسلمان مفکرین و فلاسفہ نے اُسے معلمِ ثانی کا لقب دیا ہے، ارسطاطالیس کو معلم اول تسلیم کرتے ہوئے اسے دوسرا بڑا معلم عقلیات قرار دیا ہے۔ جس نے پہلی مرتبہ اس بات کی کوشش کی کہ یونانی منطق و فلسفے کو اس طرح بیان کیا جائے کہ وہ اسلامی عقائد اور اسلامی تصورات سے متعارض نہ رہے،

چنانچہ اُس نے فلسفے و عقلیات پر جو تحریریں چھوڑی ہیں، اُن میں اُس نے نبوت، مقامِ نبوت اور منصبِ نبوت پر فلسفیانہ اور عقلی انداز سے غور وخوض کرنے کی کوشش کی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان فلاسفہ نے صرف یونانیوں کی کتابوں کے ترجمے پر اکتفا کیا۔ یقیناً یونانیوں کی کتب کے ترجمے کئے گئے، یقیناً یونانیوں اور نوافلاطونیوں کے علوم وفنون سے مسلمان قارئین اور دانش وروں کو آگاہ کیا گیا۔ لیکن یہ محض ترجمہ اور نقل نہیں تھا۔ یونانیوں کے علوم وفنون میں رسالت اور وحی کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ نبوت اور وحی و رسالت کے مضامین افلاطون اور ارسطو کے ہاں نہیں ملتے۔ یہ پہلی مرتبہ ابوالنصر فارابی نے متعارف کرائے ہیں۔ اور اس طرح سے نبوت اور وحی والہام کے موضوع پر ذریعۂ علم کے سوال پر خالص عقلی انداز میں جس شخص نے غور وخوض کی طرح ڈالی وہ ابونصر فارابی ہے، جس کو پھر حکیم ابن سینا نے مزید گہرائی وگیرائی بخشی اور خاص نبوت کا موضوع اور نبوت کے ماخذ علم ہونے کا تصور ابن سینا کے اہم مسائل اور مضامین میں سے ایک مضمون ہے۔ پھر آگے چل کر حکیم ابن رشد نے جو منطقی اور فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک حکیم اور فقیہ بھی ہے، ان عقلی مباحث کو شریعت سے زیادہ واضح طور پر اور زیادہ مضبوط طور پر ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور یہ چاہا کہ شریعت کے موقف کو اس طرح خالص عقلی انداز میں بیان کیا جائے کہ عقلیات کے نمائندے اس پر عقلی اعتبار سے کوئی اعتراض وارد نہ کر سکیں۔ یہ کلامیاتِ سیرت کا خالص عقلی اور فلسفیانہ پہلو ہے، جو ایک دوسری روایتِ علم میں بہت کثرت اور تسلسل کے ساتھ زیرِ بحث رہا ہے۔

کچھ اور حضرات نے روزِ اول سے یہ کوشش کی کہ خاصل عقلی دلائل سے کام لے کر اسلامی نقطۂ نظر کو ٹھیک ٹھیک انداز سے بیان کیا جائے، جس میں بنیادی حوالہ قرآنِ مجید، سنتِ رسول اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرتِ مبارکہ ہو، لیکن دلائل کا انداز عقلی ہو، اسلوب منطقی ہو اور جو مخاطبین ہیں، یعنی عقلیات اور فلسفے کے طلبا، ان کے لئے یہ دینی حقائق قابلِ فہم اور قابلِ قبول بن جائیں۔ یہ اسلوب امام غزالیؒ کے ہاں ملتا ہے، جنہوں نے اخلاقیات اور روحانیات کی جہت بھی اس میں پیدا کی، اس طرح خالص دینی مصادر سے کام لے کر عقلی دلائل واسلوب، یونانیوں کا طرزِ استدلال، روحانیات اور اخلاقیات ان سب کو ملا کر کوشش کی کہ اسلامی نقطۂ نظر ایک جامع انداز میں پیش کیا جائے۔ اُن کی کتاب معارف القدس میں نبوت، فلسفۂ نبوت اور وحی والہام کے بارے میں انتہائی وقیع اور عالمانہ بحثیں موجود ہیں۔

کچھ اور حضرات نے خالص روحانی انداز میں قرآنِ مجید اور سنت کی تعلیم کو روحانیات اور

اخلاقیات سے ہم آہنگ کر کے ایک نیا انداز اپنایا۔ جس کی بڑی مثال مولانا جلال الدین رومی ہیں، جنہوں نے محسوس کیا کہ عقلیات کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب میں، اور یونانی علوم وفنون کے بڑھتے ہوئے اثرات کے ماحول میں، خالص روحانی واخلاقی نقطۂ نظر کو مسلمانوں میں فروغ دیا جائے، اور بجائے انسانوں کی عقل کو اپیل کرنے کے انسانوں کے قلب کو اپیل کیا جائے۔ اور یوں اسلامی فکر میں ایک نئی جہت پیدا کی جائے۔ اس طرح سے کلامیاتِ سیرت کے دو نمونے ہمارے سامنے آئے ہیں، ایک وہ نمونہ جس کے نمائندے مولانا رومی ہیں، جن کی کتابوں میں خاص طور پر مثنوی میں سیرت کے واقعات کو اتنی کثرت اور تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ خود مثنوی مولانا روم سے اگر سیرت کے واقعات نکالے جائیں تو سیرت کی ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے، پھر خود سیرت کے واقعات ہی نہیں بلکہ سابق انبیائے کرام علیہم السلام کے واقعات اور حالات کا تذکرہ کر کے اُن کے روحانی پہلو، اُن کے پیغام کا اخلاقی سبق، یہ مولانا روم کے ہاں ایک نئے انداز سے ملتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ اُمتِ مسلمہ نے جن اثرات کو قبول کیا، یہ وہ اثرات تھے جن کے نمائندہ امام غزالیؒ ہیں۔

امام غزالیؒ بیک وقت اخلاقیات، روحانیات، فقہ واُصولِ فقہ، عقلیات منطق وفلسفہ ان سب کا ایک مجموعہ قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں، اور ان سارے علوم وفنون کے دلائل سے کام لے کر اسلامی عقائد کی توضیح اور ان پر اعتراضات کا دفاع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک طرف عقلیات کا یہ رجحان یونانیوں کے زیرِ اثر کارفرما تھا۔ دوسری طرف خود محدثین اور خالص سیرت نگاروں کے حلقے میں بعض ایسے مسائل اور سوالات پیدا ہو رہے تھے، جن کا جواب وہ علمِ حدیث کے ذخائر کی روشنی میں دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ بہت سے خالص کلامی مسائل، محدثین کے حلقے میں پیدا ہوئے، اور سب سے پہلے محدثین نے ان کا جواب دینے کی کوشش کی۔ یہ بات کہ قرآنِ مجید مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ یہ خالص عقلی اور کلامی مسئلہ ہے۔ یہ فلسفے کا مسئلے تھا لیکن محدثین کے حلقے میں پیدا ہوا۔ قرآنِ مجید کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کا جب سوال پیدا ہوا تو پہلا سوال یہ سامنے آیا کہ کلامِ الٰہی کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ خود صفاتِ الٰہی کی حقیقت کیا ہے؟ ذات وصفات میں تعلق کیا ہے؟ یہ عقلی اور فلسفیانہ مباحث سب سے پہلے محدثین نے اُٹھائے، اور اُنہوں نے خالص معارف نبوت کی روشنی میں ان کا جواب دیا اور اُمت کے بہت بڑے حصے کو اس اساس پر قائم رکھا جو قرآنِ مجید اور سنت نے قائم کی تھی۔ لہٰذا علمِ حدیث کے حوالے سے جو سوالات پیدا ہوئے، اُن میں نبوت کی حقیقت، معجزہ،

وحی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جو کلام ادا ہوتا تھا، قرآنِ مجید کی شکل میں، احادیثِ قدسیہ کی شکل میں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی احادیثِ مبارکہ کی شکل میں، ان تینوں کا فرق کیا ہے؟ ان تینوں میں تقابل دوسرے مذاہب کی کتب سے۔ یہ سارے معاملات محدثین کے ہاں زیرِ بحث آئے۔ اور محدثین نے ان کا جواب دینے کی کوشش کی۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کا یونانیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا، نہ یہ مسائل یونانیوں کے زیرِ اثر مسلمانوں میں اُٹھے۔ یہ خالص دینی اور اسلامی مسائل ہیں، یونانیوں کے ہاں نہ یہ مسائل موجود تھے، نہ ان سے ملتے جلتے کوئی اور مسائل اُن کے ہاں کبھی زیرِ بحث آئے۔ یہ خالص اسلامی موضوعات تھے، جو محدثین نے اُٹھائے، اور محدثین نے سب سے پہلے ان کا جواب دیا۔ ابونصر فارابی کی پیدائش سے بھی پہلے سے محدثین ان سوالات کو اُٹھا رہے تھے، اور ان کا جواب دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

سب سے پہلا بنیادی سوال جس کا سیرت سے براہِ راست تعلق ہے۔ وہ یہ ہے کہ خود نبوت کیا ہے؟ نبوت کی ضرورت کیا ہے؟ نبوت کی ضرورت اور حقیقت پر متکلمین، صوفیا، فلاسفہ، سیرت نگاروں، محدثین، مفسرینِ قرآن سب نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ اور اس رہنمائی کی روشنی میں جو قرآن وسنت کی شکل میں اور اُن کی اپنی بصیرت کی صورت میں اُن کے پاس موجود تھی، انہوں نے ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ پھر جب نبوت کی حقیقت اور اس کے ذرائعِ علم پر بات ہوگی تو پھر عقل اور دل اور ان دونوں کے آپس میں تعلق پر بھی بات ہوگی۔ قرآنِ کریم نے جہاں عقل کا ذکر کیا ہے، اور فکر پر زور دیا ہے، وہاں قلب وفواد پر بھی بہت زور دیا ہے، قلب وفواد کی حقیقت کیا ہے؟ اس پر بھی متکلمینِ اسلام اور صوفیائے کرام تفصیل سے گفتگو کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن کچھ وقت کے بعد یہ دونوں یعنی عقل اور قلب دو اہم رمز قرار پائے۔ عقل رمز قرار دی گئی اُس علم کا جو خالص تجربے اور مشاہدے یا استدلال پر مبنی ہو۔ جس کے لئے مولانا جلال الدین رومی علمِ حصولی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ وہ علم جو انسان اپنی کاوش اور کسب سے حاصل کرسکتا ہے، اور ہر انسان اسے حاصل کرسکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں قلب ایک رمز ہے اس علم کے لئے جو خالص روحانی اور قلبی ذرائع سے حاصل ہوا ہو اور قطعی اور یقینی ہو۔ جس کے لئے مولانا رومیؒ نے علمِ حضوری کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اور مثنوی مولانا روم میں جابجا ان دونوں کے درمیان مقابلہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

عقل کی بنیاد پر راہِ راست اختیار کرنے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کی کیفیت وہی ہے جو کسی لنگڑے کے پاؤں کی ہوتی ہے جو لکڑی کی بیساکھیوں پر چلتا ہے۔ لکڑی کی بیساکھیوں سے ضرورت تو پوری ہوجاتی ہے، وقتی تقاضا تو پورا ہوجاتا ہے، لیکن طویل اور کٹھن منزلِ مقصود لکڑی کے پاؤں کے ذریعے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ یہی بات علامہ اقبالؒ نے بھی بار بار کہی ہے، اور غالباً ان تمام مباحث کے پیش نظر جو متکلمینِ اسلام اور صوفیائے اسلام شروع سے بیان کرتے چلے آرہے ہیں، انہوں نے اس کا ایک خلاصہ اپنے قطعے میں بیان کیا ہے۔ اُن کا قطعہ ہے:

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں

یہ بات مولانا رومی کے زمانے سے صوفیائے کرام لکھتے چلے آرہے ہیں کہ عقلِ انسانی کی ذمے داریاں محدود ہیں۔ ایک جگہ مولانا روم نے لکھا ہے کہ جس ترازو سے موتی اور سونا تولا جاتا ہو اُس ترازو سے پہاڑ نہیں تولے جاسکتے۔ عقل ایک ترازو ہے، یقیناً ایک میزان ہے، لیکن یہ چند خاص چیزیں تولنے کے لئے انسان کو دی گئی ہے۔ اس سے وہ چیزیں تولنے کی کوشش کی جائے جو اس کے دائرۂ کار سے باہر ہیں، تو یہ عقل کا صحیح استعمال نہیں ہوگا۔ یہ مضمون مولانا روم کے ہاں بڑی کثرت سے ملتا ہے، علامہ اقبالؒ نے بھی اس مضمون کو بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جس چیز کے لئے انسانیت کو امامت اور راہنمائی درکار ہے، وہ محض عقل کی بنیاد پر حل نہیں ہوسکتی۔

عقلِ بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
رہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات

عقل کی بنیاد تو اس کے اپنے اندازے اور استدلال پر ہوتی ہے، عقل کا اندازہ اور استدلال ان معلومات کی بنیاد پر ہوتا ہے جو کسی انسان کے پاس ہوں، معلومات غلط ہوں گی تو اندازہ غلط ہوگا، معلومات درست ہوں گی تو اندازہ درست ہوگا۔ معلومات نامکمل ہوں گی تو اندازہ نامکمل ہوگا، معلومات مکمل ہوں گی تو اندازہ مکمل ہوگا۔ اس لئے عقل کا سارا سرمایہ ظن و تخمین سے زیادہ نہیں ہے۔ جن معاملات میں قطعیات اور یقینیات درکار ہیں اُن میں عقل کا سرمایہ ظن و تخمین اور اندازے بے کار ہیں۔

لیکن یہ بات کہ انسان کے اعمال میں اس کی سرگرمیوں میں حق و باطل کا معیار کیا ہونا چاہئے، حسن و قبح کا معیار کیا ہونا چاہئے۔ وہ خالص عقل ہو یا شریعت ہو، وہ اللہ کے رسول کا ارشاد ہو یا انسان کا تجربہ ہو، یہ بات روزِ اول سے زیرِ بحث رہی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ سے منسوب الفقہ الاکبر میں بھی یہ مضمون

بیان کیا گیا ہے، اور اس کے بعد ہر متکلم، ہر اصولی اور ہر فقیہ نے اس مضمون کو بیان کیا ہے۔

خوب و نا خوب عمل کی ہو گرہ وا کیوں کر؟

گر حیات آپ نہ ہو شارحِ اسرارِ حیات

انسانی زندگی کی ضرورت کا سارا سامان یہاں روئے زمین پر موجود ہے۔ انسانی زندگی کو جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ سب کی سب روئے زمین پر فراہم کر دی گئی ہیں، اب اگر انسان کے لئے کھانے پینے کا سامان بھی ہے، انسان کی دیگر ضروریات کی تکمیل کے سارے سامان یہاں دستیاب اور موجود ہیں، انسان اُن کو استعمال کر سکتا ہے تو انسان کی منزلِ حقیقی، فلاحِ اُخروی اور صانعِ حقیقی کی راہنمائی کا سامان کیوں موجود نہیں ہوگا۔ وہ بھی موجود ہونا چاہئے، لہٰذا نبوت اس فطری اور جبلی سوال کا جواب ہے، جو ہر انسان کرتا ہے اور اپنے مقصدِ حقیقی کے بارے میں پوچھتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کو اس موضوع سے طویل دلچسپی رہی ہے، اُنہوں نے اپنے منظوم کلام بھی میں اور منثور تحریروں میں بھی اور اپنے انگریزی خطبات میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

ایک چھوٹی سی تحریر جو انتہائی وقیع تحریر ہے، اور متکلمین کے تمام مباحث اور کاوشوں کا خلاصہ ہے، اُنہوں نے ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء میں لکھی تھی۔ دراصل یہ راجہ حسن اختر کو لکھا جانے والا ایک خط لکھا تھا۔ اس میں اُنہوں نے یہ لکھا تھا کہ ''نبوت کے تین بنیادی عناصر ہیں، پہلا بنیادی عنصر یہ ہے کہ اس کو مابعد الطبعی ذرائع سے علم حاصل ہوتا ہے، یعنی اُن ذرائع سے جو بقیہ انسانوں کو حاصل نہیں ہیں، علم حاصل ہونے کا ایسا ذریعہ جو بقیہ انسانوں کو حاصل نہ ہو، وہ کسی شخص کو حاصل ہو، تو یہ نبوت کا پہلا عنصر ہے۔ دوسرا عنصر یہ ہے کہ وہ اُس ذریعے سے جس علم کو حاصل کرتا ہے وہ علمِ یقینی اور قطعی ہو، تیسرے یہ کہ وہ اُس علم کو اپنے اور دوسروں کے لئے واجب العمل سمجھتا ہو''۔ پھر اُنہوں نے لکھا ہے کہ ''جو شخص ان تینوں چیزوں کا مدعی ہو، چاہے وہ نبوت کا لفظ استعمال نہ کرے، وہ مدعیٔ نبوت ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسا دعویٰ کرنے والا دائرۂ اسلام سے خارج اور واجب القتل ہے''۔ (۱)

یہ علامہ اقبالؒ کی ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء کی تحریر ہے، اس میں متکلمین کی بحث کا کوئی نکتہ نہیں رہ گیا، اور نبوت کی حقیقت کے خلاف کوئی چیز اس میں نہیں آتی۔ یہی تینوں چیزیں یکجا ہوں تو نبوت کہلاتی ہیں۔

نبوت اور تصورِ نبوت کا سیرت سے ایک اور تعلق بھی ہے، جس کو تمام سیرت نگاروں نے سمجھا اور اس تعلق کو کتبِ سیرت میں ظاہر بھی کیا ہے۔ وہ یہ کہ سلسلۂ نبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف

آوری کی تمہید ہے، جتنے انبیا حضور علیہ الصلاۃ والسلام سے پہلے گزرے ہیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے لئے اسٹیج تیار کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ مختلف اقوام کو فکری، دینی اور روحانی طور پر اس سطح پر لانے کے لئے بھیجے گئے تھے، جس سطح پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا جانا تھا۔ اسی لئے تمام قدیم اور بڑے سیرت نگاروں نے پچھلے انبیائے کرام اور پچھلی نبوتوں کے تذکرے سے سیرت کا بیان شروع کیا ہے۔ کسی نے حضرت آدم علیہ السلام سے شروع کیا ہے، کسی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع کیا، کسی نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے شروع کیا، لیکن سابقہ انبیائے کرام کا تذکرہ تمام سیرت نگاروں نے کیا ہے۔ حضرت عروہ بن زبیرؒ کے زمانے سے لے کر ہمارے دور کے سیرت نگاروں تک سب یہ تمہیدی تذکرہ کرتے چلے آرہے ہیں، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ سلسلۂ نبوت، منصبِ نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین سیرت النبی کا مقدمہ اور تمہید تھے، اور ان کی نبوت کو سمجھے بغیر سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھنا مقامِ نبوت کی فہم میں ممد و معاون نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دلائلِ نبوت، کلامیاتِ نبوت یا کلامیات سیرت، علمِ سیرت کا ایک لازمی حصہ قرار پایا۔

جن حضرات کے پیش نظر سیرت کے خالص تاریخی واقعات تھے، مثلاً ابن ہشام، انہوں نے بھی اشارتاً اور ان کے شارحین نے صراحتاً ان تمام مسائل سے اعتنا کیا ہے۔ علامہ سہیلیؒ کی کتاب الروض الانف ابن ہشام کی مستندترین شرحوں میں سے ہے، انہوں نے بہت سے کلامی مسائل جابجا اُٹھائے ہیں۔ روح اور نفس کی بحث کرتے ہوئے انہوں نے گفتگو کی ہے کہ روح اور نفس سے کیا مراد ہے؟ اسراء اور معراج کی حقیقت پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے، محکمات و متشابہات کا سیرت سے کیا تعلق ہے؟ یہ سب علامہ سہیلی نے بیان کیا ہے، حالانکہ سہیلی ابن ہشام کی شرح لکھ رہے تھے، اور ابن ہشام کا انداز خالص مورخانہ تھا۔ ان کو تاریخی واقعات اور تفصیلات کے علاوہ بقیہ موضوعات سے براہِ راست دلچسپی نہیں تھی، لیکن اُن کے شارح نے بھی ان مسائل کی تفصیل بیان کرنا اس لئے ضروری سمجھا کہ یہ چیزیں سیرت کا لازمی حصہ ہیں۔

جن حضرات نے ان موضوعات پر مستقل بالذات کتابیں لکھی ہیں، اُن میں سے ایک نمایاں نام قاضی عیاض کا ہے۔ قاضی عیاض اسپین کے رہنے والے تھے، وہاں کے قاضیوں میں ایک مشہور شخصیت تھے، علمِ حدیث اور سیرت پر ان کی متعدد کتابیں ہیں، انہوں نے الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ کے نام سے ایک کتاب تحریر کی، وہ تقریباً پوری کتاب ہی کلامیاتِ سیرت پر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

خصائص، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اُمت کی ذمے داریاں، اُمت پر حضور ﷺ کے حقوق، یہ سب مسائل اس کا بنیادی موضوع ہیں، انہوں نے ان تمام مسائل پر بڑے لطیف طریقے سے بحث کی ہے اور اس بحث کو قرآنِ پاک کی ایک آیت سے مربوط کیا ہے، قرآن پاک کی ایک آیت ہے:

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ط (۲)

اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

اب وہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا جو وعدہ کیا گیا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ اس سے چار قسم کی حفاظتیں مراد ہیں۔ حضور ﷺ کی جسمانی حفاظت کہ دشمن آپ ﷺ کی ذات اور زندگی کو زک نہ پہنچا سکے، پھر عقلی طور پر اس بات کی ضمانت اور تحفظ کہ قرآنِ مجید صحیح اور مکمل طریقے سے انسانوں تک پہنچ جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت انسانوں تک پہنچ جائے، اور اس میں کوئی شخص دخل اندازی نہ کر سکے، روحانی تحفظ کہ روحانی طور پر حضور علیہ الصلاۃ والسلام کا جو مقام و مرتبہ ہے، اُس کا تحفظ کیا جا سکے، اُس کو بیان کیا جا سکے، اس کی تفصیلات کو محفوظ رکھا جا سکے اور اُمت تک پہنچایا جا سکے۔ چوتھی چیز حضور ﷺ کی قلبی عصمت اور قلبی حفاظت ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک سے انہوں نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور ایک اعتبار سے پوری کتاب ہی اس قرآنی آیت کی تفسیر اور شرح ہے۔

حافظ ابن قیم نے ان میں سے بعض مسائل پر مزید تفصیلی بحث کی ہے۔ ان کی کتاب زاد المعاد ادبیاتِ سیرت کی منفرد کتاب ہے۔ اس اعتبار سے کہ انہوں نے سیرت کے بعض ایسے پہلوؤں کو بیان کیا ہے، جو بقیہ سیرت نگاروں کے سامنے نہیں تھے۔ سیرت کی عملی رہنمائی، سیرت کی فقہیات، سیرت کی روحانیات، سیرت کی قانونیات، یہ ان کے خاص دلچسپی کے موضوعات ہیں۔ لیکن اُنہوں نے کلامیاتِ سیرت کے بہت سے مسائل بھی زاد المعاد میں بیان فرمائے ہیں۔ اور بعض خاص مسائل جو سیرت نگاروں کے ہاں زیرِ بحث رہے ہیں، ان پر ابن قیم نے بھی روشنی ڈالی ہے، جن میں سے ایک مسئلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا ہے، خاص طور پر آپ کے سب سے بڑے معجزے یعنی معراج و اسرا کا اور اسرا کی نوعیت اور کیفیت کا ہے۔ اسرا پر آگے چل کر بات ہوگی، لیکن ایک بڑا مسئلہ جو عرصے سے زیرِ بحث رہا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج پر تشریف لے گئے تو یہ معراج جسمانی تھی یا روحانی؟ یہ مسئلہ شروع سے زیرِ بحث رہا ہے، صحابہؓ کے زمانے سے اس پر بات ہوتی رہی ہے کہ معراج کی نوعیت کیا تھی؟ صحابۂ کرامؓ سے جو کچھ منقول ہے، اور متقدمین نے اس پر جو کچھ لکھا تھا اس کی پچھلے سو سال سے خاص

انداز سے تعبیر ہونے لگی ہے، ایک رجحان برصغیر میں اور اس سے باہر یہ پیدا ہوا کہ معراج کی نوعیت ایک خواب کی تھی۔ یہ ایک خواب تھا، جس میں وہ تمام مناظر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دکھائے گئے۔ یہ بات بعض اہلِ علم نے اس بنیاد پر کہی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے تو **مافقد جسمہ** آپ کا جسمِ مبارک یہیں موجود رہا اور مفقود نہیں ہوا۔ اس کی ایک تعبیر تو یہ ہوسکتی ہے جو ان لوگوں نے کہی کہ یہ سارا خواب کا معاملہ تھا۔ لیکن علمائے اُمت کی غالب ترین اکثریت صحابۂ کرامؓ کے زمانے سے لے کر آج تک اس بات کی قائل رہی ہے کہ معراج خواب نہیں تھی، اگر یہ کوئی خواب تھا تو یہ کوئی نشانی اور معجزے کی بات نہیں ہے، خواب میں ہر شخص ہر جگہ ہر وقت پہنچ سکتا ہے، ہم میں سے ہر شخص کو اس کا تجربہ ہوا ہوگا کہ وہ خواب میں امریکہ، انگلستان اور کعبۂ مشرفہ کی سیر کر آیا۔ معراج کی نوعیت اگر خواب کی تھی تو یہ کوئی معجزہ نہیں ہے، اور قرآنِ مجید جس غیر معمولی انداز سے اس کو بیان کرتا ہے کہ:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ط (۳)

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجدِ اقصیٰ تک لے گئی۔ جس کے گرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں تاکہ ہم اس کو اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھائیں۔

یہ آغاز خود اس بات کو بتاتا ہے کہ یہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہے، جو پیش آیا ہے۔ اگر یہ محض خواب کا واقعہ ہوتا تو اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس لئے یہ بات تو تمام متکلمین، محدثین اور مفسرین نے واضح کر دی ہے کہ یہ خواب کا معاملہ نہیں تھا۔ اب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس قول کی کیا تعبیر کی جائے کہ **ولم یفقد جسدہ** (۴) حضور ﷺ کا جسم مبارک موجود رہا اور ایک لمحے کے لئے بھی مفقود نہیں ہوا۔ حافظ ابن قیم نے اس پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے، اور نفسیات، عقل، منطق اور روحانیات کے دلائل دے کر یہ بتایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ مبارک کو لے جایا گیا۔ جب انسان سوتا ہے تو اس کی روح اُس کے جسم سے الگ نہیں ہوتی۔ وہ اسی جسم میں رہتی ہے۔ انبیائے کرام کے بارے میں ایک عام عقیدہ یہ ہے کہ اُن کے اس دنیا سے تشریف لے جانے اور ان پر موت طاری ہونے کے بعد بھی اُن کے جسم کا اُن کی روح سے تعلق رہتا ہے۔ اسی قسم کا تعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

جسمِ مبارک سے آپ کی روح کا رہا، اور روحِ مبارک کو لے جایا گیا اور یہ سارے مشاہدات روحِ مبارک کو کرائے گئے۔ اس کا خواب سے یا سونے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو صرف انبیا کے ساتھ خاص ہے، یہ بحث میں نے اس لئے پیش کی کہ یہ ابن قیم کی گفتگو کا خلاصہ ہے، اور انہوں نے کوشش کی ہے کہ ان تمام احادیث میں تطبیق دے کر جمع کریں جو اسراء و معراج کو خالصتاً جسمانی واقعہ قرار دیتی ہیں یا اسے روحانی واقعہ قرار دیتی ہیں، روحانی واقعے کے بارے میں وہ یہ غلط فہمی دور کرنا چاہتے ہیں کہ یہ کوئی خواب کی طرح کا واقعہ تھا یا یہ محض کوئی تصوراتی چیز تھی۔ یا ایسی چیز تھی جو کسی اور انسان کے تجربے میں بھی آ سکتی ہے۔ حافظ ابنِ قیمؒ کے الفاظ ہیں:

ولکن ینبغی ان یعلم الفرق بین ان یقال کان اسراء مناماً وبین ان یقال کان بروحه دون جسده وبینهما فرق عظیم (۵)

یہ یاد رکھنا چاہئے اور ان دونوں کے درمیان فرق کرنا چاہئے کہ اسرا ایک خواب تھا اور اس بات میں کہ اسرا روحِ مبارک کے ساتھ ہوئی، جسمِ مبارک کے ساتھ نہیں ہوئی۔ ان دونوں کے درمیان بڑا فرق ہے۔

اسرا پر مزید گفتگو آگے چل کر ہوگی۔ کلامیاتِ سیرت پر برصغیر میں متعدد شخصیتوں نے کام کیا ہے، لیکن سب سے نمایاں کام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی کتاب جو اُن کی سب سے نمایاں کتاب ہے، اور ان کا خاص کارنامہ ہے، حجۃ اللہ البالغہ۔ ایک اعتبار سے اس پوری کتاب کا مضمون ہی کلامیاتِ سیرت ہے، اس کتاب میں اُنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور سنت کے وہ حقائق اور معارف بیان کئے ہیں، جو عام انسانوں کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ اور ان حقائق و معارف کی بنیاد پر جن کو وہ اسرارِ حدیث کہتے ہیں، انہوں نے ایک ایسا عقلی اور روحانی نظام مرتب کیا ہے جو اسلامی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے، اور ابھی تک کوئی بھی حضرت شاہ صاحب کے اس کام میں مزید اضافہ نہیں کر سکا۔ ابھی تک وہ اپنی نوعیت میں منفرد اس کام کے فاتح بھی ہیں اور ابھی تک اس کام کے خاتم بھی۔ شاہ صاحبؒ نے اس کتاب کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے، ایک حصہ تو بنیادی کلیات اور اُصولوں کا ہے، جس میں اُنہوں نے وہ تمام بنیادی مسائل ایک عقلی اور منطقی انداز میں بیان کئے ہیں، دینی اور شرعی دلائل کے ساتھ، جن کی بنیاد پر کارِ نبوت نے کام کا آغاز کیا، اور شریعت کی تفصیلات حضور ﷺ نے بیان فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مکلف کیوں قرار دیتا ہے؟ پھر انسان کو مکلف قرار دینے کے بعد جزاو

سزا کا نظام کیوں رکھا گیا ہے، یہ جزا وسزا کس نوعیت کی ہے؟ انسان کی معاشرتی اور اجتماعی ضروریات کیا ہیں؟ انسان کی کامیابی اور کامرانی کی حقیقت کیا ہے؟ کس چیز کو اصل میں کامیابی اور کامرانی کہتے ہیں؟ اور کس چیز کو ناکامی اور ناکامرانی کہتے ہیں؟ اور نیکی اور بدی کیا ہے؟ کس چیز کو کس بنیاد پر نیکی کہا جائے گا؟ اور کس کام کو کس بنیاد پر بدی کہا جائے گا؟ پھر مسلمانوں کی اجتماعیات بالخصوص اور دیگر انسانوں کا اجتماعی نظام بالعموم کیوں قائم ہوتا ہے، کیسے قائم ہوتا ہے، اور اس کی ضرورت کیوں ہے؟ علومِ نبوت اس اجتماعیت کو قائم کرنے میں کیا کارنامہ انجام دیتے ہیں۔ اس طرح شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے علومِ نبوت کو جو سیرت کا ایک حصہ ہیں، پوری انسانی معاشرت کی اساس اور انسانی کامیابی کی ایک بنیاد اور لازمی شرط قرار دیا ہے۔

دوسرے حصے میں جہاں شاہ صاحب نے اسرارِ شریعت اور اسرارِ حدیث بیان کئے ہیں، وہاں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کتاب کے بنیادی مقاصد میں جو چیز میرے پیشِ نظر ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کو اس طرح واضح اور منقح کر کے پیش کر دیا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ یعنی آپ کی لائی ہوئی شریعت اور اس کا اصل کارنامہ لوگوں کے سامنے آجائے۔ یعنی اسلامی شریعت کا کمال، مشککین کی تردید اور اہل ایمان کے لئے اطمینان جس چیز سے حاصل ہو، وہ میں نے اُن کے سامنے رکھ دی ہے۔ یہ کتاب کلامیات سیرت کی ایک ایسی اساسی کتاب کے طور پر سامنے آئی ہے جو اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے، اور اسلامی تاریخ میں کوئی اور کتاب اس انداز اور اس ترتیب کے ساتھ موجود نہیں ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی یہ بیان کرتے ہیں کہ انسان کو اپنی حقیقی کامیابی و کامرانی کے لئے ایسے راہنماؤں کی ضرورت ہے جو ملتیں قائم کر سکیں، جن کی تعلیم کی بنیاد پر اُمت کی تشکیل کی جا سکے، اور وہ ایسا دیرپا اور دائمی نظام دنیا کو دے سکیں جو اُمت کے لئے حقیقی سعادت اور کامرانی کا ذریعہ اور ماخذ ہو۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے شاہ صاحب نے دلائل دیئے ہیں، ایک بنیادی دلیل یہ دی ہے کہ ہر معاملے میں متخصصین اور ماہرین کی ضرورت انسانوں نے ہر دور میں محسوس کی ہے، انسان ہر معاملے میں متخصصین سے رجوع کرتا ہے، اور ان لوگوں کی راہنمائی کے مطابق زندگی کے مختلف گوشوں میں کام کرتا ہے، جو کسی خاص فن میں مہارت اور علم کا ایسا ذریعہ رکھتے ہوں، اور ایسے علم تک رسائی رکھتے ہوں جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہو۔ یہی ضرورت انبیا علیہم السلام کے لئے بھی ہے کہ اُن کو ایک ایسے ذریعۂ علم تک رسائی حاصل ہے، جو عام انسانوں کو حاصل نہیں ہے، اور اس علم کی بنیاد پر ایک اُمت کی تشکیل اور شریعت کی تکمیل کی جا سکتی ہے۔

پھر شاہ ولی اللہؒ نے مختلف انبیائے کرام کی تعلیم میں جو ارتقا ہوا ہے، اُس کی طرف اشارہ کیا

ہے، اور آخر میں کہا ہے کہ جب انسانیت ایک ایسے مرحلے پر آگئی کہ اب عالم گیریت اور بین الاقوامیت کے ایک نئے دور کا آغاز ہونے والا تھا، اس وقت ضرورت تھی کہ ایک ایسا دین بھیجا جائے جو تمام ادیان کا ناسخ ہو، ایک ایسی شریعت اُتاری جائے جو تمام شریعتوں کو مکمل کرنے والی ہو۔ اور عدل وانصاف کے وہ پہلو جو پہلے رہ گئے تھے اُن سب کی تکمیل کر کے لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۶) ''تاکہ وہ اسے تمام دینوں پر غالب کردے'' کی کیفیت پیدا کردی جائے۔ یہ ختم نبوت کا وہ تصور ہے جو شاہ صاحبؒ نے اس کتاب میں دیا ہے، جس چیز کو شاہ ولی اللہؒ تکمیل کا نام دے رہے ہیں، اور جس چیز کو وہ لیظهره على الدين كله کے حوالے سے بیان کررہے ہیں، وہ دو چیزیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام کے تشریف لانے سے پہلے بعض ایسے مسائل اور مشکلات انسانوں کو درپیش تھیں جن کا جواب انسانوں کے پاس نہیں تھا۔ یا ایسے مسائل ومشکلات کا انسان شکار تھے جن کا حل اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ حضور ﷺ نے ان مشکلات کو دور کیا اور ان مسائل کا حل پیش کیا۔ ان مسائل ومشکلات میں سے ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ مذہبی علم خاص طور پر مختلف اقوام اور مختلف طبقوں کی اجارہ داری میں تھا اور عام انسان کی دینی علوم تک رسائی نہیں تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجارہ داری کو ختم کردیا۔ مذہبی اور غیر مذہبی تعلیم کے درمیان ایک بعد اور تفریق تھی، کچھ اقوام میں جو مذہبی تعلم کی علم بردار ہیں، کچھ اقوام میں جو غیر مذہبی تعلیم کی علم بردار ہیں، اور اُن علوم کی بنیاد پر ان دونوں کے ہاں الگ الگ تہذیب، تمدن پرورش پارہا تھا۔ ایک تہذیب وتمدن خالص غیر مذہبی بنیادوں پر قائم تھا، جبکہ دوسری تہذیب اور تمدن خالص مذہبی بنیادوں پر استوار تھا۔ ایسی تہذیب جس میں دونوں علوم کو یکجا کیا گیا ہو، مذہبی وغیر مذہبی تعلیم میں یکجائی و یکسانیت پیدا کی گئی ہو، یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نہیں تھی۔

اسلام سے پہلے مختلف اقوام میں اوہام پرستی کی جڑیں بہت گہری تھیں، جس کے نتیجے میں انسان کے لئے تحقیق کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں پیدا ہورہی تھیں۔ انسان کائنات کے حقائق پر اُس وقت غور کرسکتا ہے، جب وہ اوہام پرستی سے نجات پاجائے۔ اوہام پرستی، اصنام پرستی اور مظاہر پرستی کے ساتھ کائنات کے حقائق پر آزادانہ غور وخوض نہیں ہوسکتا۔ یہ آزادانہ غور وخوض اُسی وقت شروع ہوسکا جب آپ ﷺ کی تعلیم نے ان اوہام کو ایک ایک کرکے ختم کردیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس تعلیم کو فروغ دیا وہ ایک عملی، مفید اور حقیقی علم تھا۔ غیر حقیقی، غیر عملی اور مجرد نظریات کی بنیاد پر کسی علم کو اسلام نے حوصلہ افزائی کا مستحق نہیں سمجھا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو دعا مانگی وہ اپنے لئے بھی علمِ نافع کی مانگی

اور اپنی اُمت کو بھی سکھایا کہ وہ علم نافع کی دعا کریں اور غیر مفید علم سے اللہ کی پناہ مانگیں۔ گویا علم کے دو درجے ہو سکتے ہیں، ایک وہ علم جو انسانیت کے لئے مفید ہو، دوسرا وہ جو انسانیت کے ضرر رساں ہو۔ علم کی اس وحدت اور جامعیت کے فروغ کے لئے ضروری تھا کہ عقل اور نقل میں توازن پیدا کیا جائے، اس توازن کے بغیر نہ دین کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں نہ دنیا کے۔ جن اقوام نے نقل پر زیادہ زور دیا ان میں عقل کے تقاضے مجروح ہو گئے، اور جن اقوام نے عقل کے تقاضوں پر زیادہ زور دیا اُن میں مذہب کے تقاضے مجروح ہو گئے۔ عقل و نقل دونوں کے تقاضے بیک وقت جمع کرنے کی کاوش صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے ذریعے ممکن ہوئی۔ یہ تھا ایک عام پس منظر اُس فن کا جسے ہم کلامیاتِ سیرت کہہ سکتے ہیں، اس کا آغاز کیسے ہوا؟ اس میں کون کون سے مسائل زیرِ بحث آئے؟ اور کن مصنفین نے کس انداز سے اس فن پر گفتگو کی اس کی چند جھلکیاں آپ کے سامنے پیش کی گئیں۔ اب میں دو سوالوں کا جواب اور دینا چاہتا ہوں۔

ایک یہ کہ جس چیز کو ہم معجزہ کہتے ہیں جو کلامیات سیرت کا سب سے نمایاں مضمون ہے، اس سے مراد کیا ہے؟ اس پر اکابرِ اسلام نے کیا لکھا ہے؟ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے بڑے معجزات جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں، ان کے بارے میں سیرت کے ادب میں کیا معلومات ملتی ہیں؟ نبوت قرآنِ مجید کی خاص اصطلاح ہے، نبوت اور نبی ایک ایسا لفظ ہے جو عربی کے علاوہ عبرانی میں بھی قریب قریب اسی مفہوم اور اسی تلفظ کے ساتھ ملتا ہے، اصطلاحی اعتبار سے نبی سے مراد وہ ذات ہے جسے براہِ راست اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے علم حاصل ہو۔ اور علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ایسا علم جو قطعی اور یقینی ہو اور متلقی کے لئے اور دوسرے انسانوں کے لئے واجب التعمیل ہو، اُس ذات کو نبی کہا جاتا ہے۔

اس بارے میں مفسرین اور متکلمین کے درمیان اختلاف رہا ہے کہ کیا نبی اور رسول ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں؟ یا نبی اور رسول کا مفہوم الگ الگ ہے۔ کچھ لوگ اس کے قائل ہیں کہ نبی اور رسول کا مفہوم ایک ہے، کچھ لوگ اس کے قائل ہیں کہ نبی اور رسول کا مفہوم الگ الگ ہے، اکثریت یہی سمجھتی ہے کہ نبی اور رسول کا مفہوم الگ الگ ہے، اس پر لمبی بحثیں ہیں، لیکن ہمارے برصغیر کے ترجمان القرآن شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ نے ایک جملے میں اس فرق کو بیان کیا ہے، ''نبی وہ ہے جس کو وحی ملے، رسول وہ ہے جس کو نئی کتاب یا نئی اُمت، یا نئی شریعت دی گئی ہو''۔ یعنی اگر نئی کتاب تو نہیں دی گئی لیکن نئی اُمت کے پاس اُس کو بھیجا گیا تو وہ بھی رسول ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شریعت وہی تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت تھی، اُن کی کتاب وہی تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اُتاری گئی تھی، لیکن اُنہیں نئی

قوم اور نئی اُمت کی طرف بھیجا گیا، اس لئے اُنہیں رسول قرار دیا گیا۔ یہ فرق ہے رسول اور نبی میں۔

لفظ نبوت لغوی اعتبار سے دو مفہوم رکھتا ہے اور متکلمین نے یہ دونوں مفہوم قرار دیئے ہیں، نبی کا ایک مفہوم تو ہے خبر دینے والا، نبـــاء عربی زبان میں کسی اہم خبر کو کہتے ہیں، چونکہ نبی اہم خبریں اللہ کی طرف سے دیتا ہے، اللہ کی مرضی کا ترجمان ہے، اس لئے اُسے نبی کہا گیا، اور قرآنِ پاک میں نبی جہاں بھی آیا ہے، وہ اسی مفہوم میں آیا ہے، حفص کی روایت میں ہمزہ تخفیف کی وجہ سے حذف کر دیا گیا۔ لیکن ورش کی روایت میں نبیٔ ہمزہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ ایک دوسری رائے یہ ہے کہ یہ نبوۃ سے ماخوذ ہے، جس کے معنیٰ ہیں بلند مرتبہ ہونا، چونکہ نبی انسانوں میں سب سے بلند مرتبہ ہوتا ہے، اس لئے اس کو نبی کہا گیا ہے۔ دونوں مفہوم بیک وقت بھی درست ہو سکتے ہیں۔ اصطلاحی اعتبار سے نبی کی تعریف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا سفیر ہے، اللہ تعالیٰ کا ترجمان ہے اور اللہ تعالیٰ کے بندوں اور اُس کی مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اُس کے پیغام سے آگاہ کرتا ہے، ابونعیم نے دلائل النبوۃ میں لکھا ہے:

النبوۃ هو سفارۃ العبد بین الله و بین ذوی الالباب من خلیقته۔

نبوت ایک سفارت ہے جو اللہ اور اُس کی مخلوقات میں جو صاحبِ عقل ہیں، اُن کے درمیان پیغام رسانی سے عبارت ہے۔

یہ نبوت جو دراصل رسالت کی ایک شکل ہے، یہ بعض خصائص کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ ان خصائص پر ابونعیم اور دوسرے حضرات نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ نبوت کے لئے ضروری ہے کہ نبی اللہ تعالیٰ کا خاص مقرب انسان اور مقرب شخصیت ہو۔ اُس کو اللہ تعالیٰ نے خاص اہتمام سے چنا ہو:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ یَّشَآءُ۔ (۷)

لیکن اللہ تعالیٰ (غیب پر مطلع کرنے کے لئے) اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔

اسی طرح دوسری جگہ فرمایا:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسٰلَتَهٗ ط (۸)

اللہ ہی اس بات کو جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں بھیجے اور کہاں اُتارے؟

لیکن نبوت اور رسالت میں ولایت شامل ہے، ہر نبی ولی ہوتا ہے، اور وہ اولیا میں سب سے اُونچا درجہ رکھتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ہر ولی نبی نہیں ہوتا۔ کسی وجہ سے بعض صوفیا میں یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ

ولایت نبوت سے افضل ہے، اور اُنہوں نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ ولی کا تعلق اللہ کی ذات سے رہتا ہے، وہ رُو بہ حق ہوتا ہے۔ اور نبی کا تعلق مخلوق سے ہے وہ رُو بہ خلق ہوتا ہے، تو رو بہ حق ہونا افضل ہے، رو بہ خلق ہونے سے۔ جب اس پر اعتراض ہوا کہ یوں تو نبوت کا درجہ کمتر قرار پاتا ہے تو اُنہوں نے اس کا جواب یوں دیا کہ نبی کی ولایت اُس کی نبوت سے افضل ہے، غیر نبی کی ولایت نہیں۔ (۹) یہ تاویل بھی اس میدان کے مزاج شناسوں نے پسند نہیں کی۔ اس ضمن میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے جن کو علامہ اقبالؒ نے مسلم انڈیا کا سب سے بڑا مذہبی عبقری قرار دیا تھا۔ ایک جگہ تفصیل سے کلام کیا ہے۔

مجدد صاحب فرماتے ہیں کہ بعض صوفیا جذب کے عالم میں بات کرتے رہے ہیں، جو زیادہ مستند اور قابل اعتبار نہیں ہے، جذب کی کیفیت میں انسان کو اپنے احساس اور عقل پر کنٹرول نہیں رہتا۔ اور جذب کی کیفیت میں اُس کی زبان سے ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں جو درست نہیں ہوتے۔ اور اسی کیفیت میں بعض لوگوں کی زبان سے یہ نکلا کہ ولایت نبوت سے افضل ہے، پھر اُنہوں نے بہت تفصیل سے اس کی تردید کی ہے، اور یہ ثابت کیا ہے کہ نبوت سب سے افضل درجہ ہے، جو انسانوں کو حاصل ہوسکتا ہے، چاہے اس نبوت کی ولایت ہو، یا کسی اور نبی کی ولایت ہو۔ ایک اور جگہ اپنے مکتوبات میں لکھا ہے:

> جمعے از نارسائی بہ کمالاتِ نبوت گفتہ اند الولایۃ افضل من النبوۃ، فقیر در کتب و رسائل خود نوشتہ است وتحقیق نمودہ است کہ کمالاتِ نبوت حکم دریائے محیط دارد، وکمالاتِ ولایت در جنبِ آں قطرۂ ایست محقر۔ (۱۰)
>
> بعض لوگ اپنی فکری نارسائی کی وجہ سے یہ کہنے لگتے ہیں کہ ولایت نبوت سے افضل ہے۔ میں نے اپنی کتابوں اور تحریروں میں اس کی تحقیق کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ کمالاتِ نبوت کی حیثیت ایک دریائے محیط کی ہے۔ اور کمالاتِ ولایت کی حیثیت اُس کے مقابلے میں ایک حقیر قطرے کی ہے۔

مجدد صاحبؒ کی نظر میں کمالاتِ نبوت اور کمالاتِ ولایت میں یہ نسبت ہے۔ کمالاتِ نبوت اور خواصِ نبوت پر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بھی روشنی ڈالی ہے، اور اُنہوں نے بھی جابجا نبوت و رسالت کو بیان کیا ہے۔

نبی کا ذریعۂ علم وحیٔ الٰہی ہے، وحیٔ الٰہی کی طرف قرآنِ پاک میں اور سابقہ مذہبی کتب میں بہت سے اشارے کئے گئے ہیں۔ وحی کا لفظ، عربی زبان میں دو مفہوموں کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک

مفہوم جو بہت عام ہے، یہ ہے کہ خاموشی سے جلدی کے ساتھ کسی شخص کو کوئی ایسا اشارہ کر دینا جس سے وہ پیغام سمجھ لے، یہ اشارہ عربی زبان میں وحی کہلاتا ہے۔ چونکہ انبیا علیہم السلام تک انتقالِ علم اتنا لطیف ہوتا ہے کہ عام انسان کی اُس تک رسائی ممکن نہیں ہوسکتی، اور اتنی جلدی ہوتا ہے کہ انبیاء اُس کو حاصل کر لیتے ہیں، اس لئے اس ذریعۂ علم کے لئے وحی کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ وحی کا دوسرا مفہوم عربی زبان میں کسی پتھر یا مضبوط چیز پر ایسا نقش کر دینا جو مٹ نہ سکے، اسے بھی وحی کہتے ہیں، لبید جو مشہور شاعر ہے، اور سبعہ معلقات کے شعرا میں سے آخری شاعر ہے، اس کا شعر ہے:

فمدافع فی الریان عری رسمها

خلقا کما ضمن الوحی سلامها

وہ منظر یہ بیان کر رہا ہے کہ جس جگہ میرے جاننے والے ٹھہرے ہوئے تھے، جب قافلہ چلا گیا تو اُن کے آثار پر گرد پڑ گئی اور وہ مٹ گئے، جب بارش ہوئی تو اس سے وہ گرد بہ گئی اور وہ آثار دوبارہ نمایاں ہو گئے، اس طرح نمایاں ہو گئے جیسے لکھنے والے اپنے قلم سے دوبارہ اپنے نقوشِ تحریر کو زندہ کر دیں۔

یہاں انہوں نے وحی کا لفظ اس نقش کے لئے استعمال کیا ہے جو پتھر پر ہو اور ناقابلِ شکست ہو جس کو مٹایا نہ جا سکے۔

دلائلِ نبوت پر جن لوگوں نے لکھا ہے، اُن میں سب سے مستند اور قدیم کتاب ابونعیم اصبہانی کی ہے، جنہوں نے پہلے دلائل النبوۃ کے نام سے ایک بڑی کتاب لکھی تھی۔ جس میں حضور علیہ الصلاۃ والسلام کے فضائل، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بشارتیں، آپ ﷺ کے معجزات، قرآنِ مجید کی تاثیر، ان سب کا ذکر کیا گیا تھا۔ پھر بعد میں اس کتاب کا خلاصہ لکھا جو دو جلدوں میں کئی بار چھپا ہے، اس خلاصے میں انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کا تذکرہ کیا ہے، حضور ﷺ کے فضائل جو قرآنِ پاک میں آئے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل جو آپ ﷺ کی سیرت سے سامنے آئے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل جو آپ کے ارشادات سے سامنے آئے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل جو سابقہ آسمانی کتابوں میں دی گئی بشارتوں سے ہمارے سامنے آئے ہیں، ان سب کتابوں میں جو دلائلِ نبوت پر لکھی گئیں، ایک اہم مضمون سابقہ کتابوں میں آنے والی بشارتیں بھی ہیں۔ مختلف آسمانی کتابوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی بشارتیں کیسے دی گئیں؟ کس انداز سے حضور ﷺ کی تشریف آوری کو بیان کیا گیا۔ یہ مضمون دلائلِ نبوت اور شواہدِ نبوت کی کتابوں میں ایک اہم

مضمون کی حیثیت سے تفصیل سے ملتا ہے۔

شواہدِ نبوت پر ایک کتاب ہمارے برادر پڑوسی ملک افغانستان کے ایک بزرگ مولانا نور الدین جامی کی جو فارسی کے مشہور شاعر، عربی زبان کے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ مفسر، محدث اور متکلم بھی تھے، شواہدِ نبوت ہے، جس میں انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ امتیازی اوصاف جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک میں پائے جاتے ہیں، سات الگ الگ عنوانات کے تحت بیان کئے ہیں۔ شواہدِ نبوت قبلِ ولادت۔ شواہدِ نبوت وقتِ ولادت۔ شواہدِ نبوت از بعثت تا ہجرت، شواہدِ نبوت از ہجرت تا وصال، شواہدِ نبوت بعداز وصال، شواہدِ نبوت بہ دستِ صحابۂ کرامؓ، شواہدِ نبوت بدست تابعین، تبع تابعین، صوفیائے کرام۔ مولانا جامی چونکہ شاعر وادیب بھی تھے، اس لئے اُن کی کتاب ادبی اعتبار سے بھی اُونچے درجے کی کتاب ہے۔ اس میں اُنہوں نے معجزات بھی بیان کئے ہیں، اور جہاں جہاں جس معجزے کو بیان کرنا مناسب سمجھا اُس معجزے کی تفصیل بھی دی ہے۔

ان کے بعد اس موضوع پر سب سے آخری جامع کتاب علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی الخصائص الکبریٰ ہے، جس میں اُنہوں نے معجزات کے بارے میں بہت سی روایات جمع کی ہیں، علامہ جلال الدین سیوطی بہت عالم فاضل انسان تھے، لیکن ایک مسلمان کا یہ مزاج ہے کہ وہ ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت اور عقیدت رکھتا ہے۔ محبت وعقیدت کا یہ خاصہ ہے کہ اس کی شدت میں بعض اوقات تحقیق کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے بھی اس کتاب میں بہت سی چیزوں کے بارے میں تحقیق نہیں کی۔ اور بعض ایسی روایات اس میں آ گئیں جو تحقیق کے معیار پر پوری نہیں اُترتیں۔ علمِ حدیث کے روایت ودرایت دونوں اُصولوں کی روشنی میں جب ان روایات کا جائزہ لیا جائے تو وہ کمزور ثابت ہوتی ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے سیرت النبی میں معجزات پر بحث کرتے ہوئے علامہ سیوطیؒ کی الخصائص الکبریٰ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اور اس میں موجود کمزور روایات کی نشان دہی کی ہے، لیکن یہ کتاب بہت سی کتابوں کا ماخذ رہی ہے، اور اُردو اور فارسی میں جتنے میلاد نامے لکھے گئے اُن میں بہت سی تفصیلات علامہ سیوطی کی اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

معجزات اور شواہدِ نبوت پر جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں بہت سی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں، بینہ کی اصطلاح بھی استعمال ہوئی ہے، جس کے معنی واضح دلیل اور نشانی کے ہیں، قرآنِ کریم میں بینات کا لفظ استعمال ہوا ہے: وَلَقَدْ جَآءَ هُمْ مُّوسٰى بِالْبَيِّنٰتِ (۱۱) لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ (۱۲)

ہم نے اپنے رسولوں کو بینات کے ساتھ بھیجا۔ آیت کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے، آیت کے معنیٰ ہیں نشانی۔ معجزے کا لفظ قرآنِ پاک میں براہِ راست نہیں لیکن بالواسطہ استعمال ہوا ہے، قرآنِ پاک میں برہان اور دلیل کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے، بعض احادیث میں شواہد اور علامات کی اصطلاح بھی استعمال ہوئی ہے، لیکن عام طور پر معجزے کی اصطلاح اسلامی ادب میں مشہور ہے۔ اگرچہ قرآنِ پاک میں معجزے کا لفظ خاص اس مفہوم کے لئے بطور اسم استعمال نہیں ہوا۔ اور نہ احادیث میں استعمال ہوا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا جن جن حضرات نے استقصا کیا ہے اور اُنہیں جمع کیا ہے۔ اُنہوں نے تین قسم کے معجزات بیان فرمائے ہیں۔ سب سے بڑا معجزہ تو قرآنِ پاک ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ثبوت کی تائید اور نبوت میں جب بھی کوئی معجزہ پیش فرمایا تو قرآنِ پاک کو پیش فرمایا۔ یوں تو آپ کے دست مبارک سے بہت سے معجزے سامنے آئے، جن میں سے بعض کی مثالیں آگے آرہی ہیں، لیکن اُن میں سے کسی معجزے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیلنج کے جواب میں پیش نہیں کیا۔ جب کوئی چیلنج کسی طرف سے دیا گیا اور آپ ﷺ کی نبوت کے ثبوت کی نشانی مانگی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنِ پاک ہی کو اس کے ثبوت میں پیش کیا۔ قرآن حکیم میں ایک جگہ کفارِ مکہ کا اعتراض نقل ہوا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ:

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ط (۱۳)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نازل نہیں کی گئیں۔

اس کا جواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ دیا گیا:

اَوَلَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰى عَلَیْهِمْ ط (۱۴)

کیا ان کے لئے بطورِ نشانی کے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر قرآن اتارا جس کی آیات تلاوت کی جارہی ہیں۔

گویا قرآنِ کریم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کے ثبوت اور معجزے کے طور پر پیش کیا۔ قرآنِ مجید کس اعتبار سے معجزہ ہے، اس کے اعجاز کے پہلو کیا کیا ہیں؟ اس پر چودہ سو سال سے لوگ غور کرتے چلے آرہے ہیں، اور اس کے اعجاز کے نئے نئے پہلو بیان کرتے چلے آرہے ہیں، لیکن یہ بات علم سیرت کے بجائے علومِ قرآن سے تعلق رکھتی ہے۔

دوسرا معجزہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں بڑا نمایاں ہے، اور خود قرآنِ پاک میں بیان ہوا ہے، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسراء کا معجزہ ہے، معجزۂ اسراء یا معجزۂ معراج، جس کا تذکرہ پہلے بھی آچکا ہے، قرآنِ پاک میں جس انداز سے اس کا بیان ہوا ہے، اور جن زورِ بیاں سے عالی شان آغاز اس کا ہوا ہے، اس سے یہ بات خود بہ خود واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی بہت غیر معمولی بات بیان فرمائی جارہی ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ (۱۵)

پاک ہے وہ ذات جو راتوں رات اپنے بندے کو مسجد الحرام سے مسجدِ اقصیٰ تک لے گئی، تا کہ ہم اُن کو اپنی نشانیاں دکھائیں۔ (۱۶)

بڑی بڑی نشانیاں دکھانا اور راتوں رات مسجد الحرام سے مسجدِ اقصیٰ تک لے جانا اور وہ ذات جس کے بارے میں آغاز میں کہا گیا کہ وہ انتہائی پاکیزہ اور برتر ذات ہے۔ یہ غیر معمولی اندازہ بیان خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کوئی خواب یا منام کی چیز نہیں تھی۔ بلکہ یہ ایک ایسی غیر معمولی چیز تھی جو دوسرے انسانوں کو پیش نہیں آئی۔ اگر یہ محض خواب ہوتا تو کفارِ مکہ کی طرف سے اس کی تردید و تکذیب کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ خواب ہر شخص دیکھتا ہے، اور کوئی کسی کی تردید نہیں کرتا۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ اجمعین میں سے جنہوں نے سب سے پہلے اس کی تصدیق کی یعنی سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ، اُنہیں اسی تصدیق کی بنا پر صدیق کا لقب دیا گیا، خواب کی بنیاد پر تصدیق کرنے پر صدیق کا لقب دیئے جانے کا کوئی مفہوم نہیں بنتا۔

اسراو معراج کے علاوہ ایک اور معجزے کا ذکر قرآنِ پاک میں آیا ہے، وہ شقِ قمر کا معجزہ ہے:

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ O (۱۷)

ان کے علاوہ جتنے معجزات آئے ہیں وہ اکثر و بیشتر کتبِ حدیث میں ہیں، جن میں بڑی تعداد میں کتبِ صحاح میں بیان ہوئے ہیں، اُن معجزات کی تعداد کیا ہے؟ اُن کی تفصیلات کیا ہیں؟ اُن میں سے بعض بطورِ مثال کے میں عرض کرتا ہوں، لیکن اس سے پہلے ایک بنیادی سوال جو متکلمین نے اُٹھایا جو بڑا اہم سوال ہے، وہ یہ ہے کہ معجزے کا مقصد کیا ہے؟ اگر معجزے کا مقصد یہ ہے کہ نبوت کی تائید اور اس کا ثبوت معجزے سے ہوتا ہے تو تاریخی طور پر پتا چلتا ہے کہ معجزے دیکھنے کے باوجود بہت سے لوگ ایمان نہیں لائے، اور بہت سے ایسے لوگ تھے جو معجزہ دیکھے بغیر ایمان لے آئے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا۔ جب پہلی مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا

کہ یہ تجربہ ہوا ہے تو اُنہوں نے فوراً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور صداقت پر ایمان لانے کا اعلان کر دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں خود حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو بھی میں نے دین کی طرف بلایا اُس نے کچھ نہ کچھ تأمل ضرور کیا سوائے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے۔ جیسے ہی میں نے ان سے کہا انہوں نے فوراً تسلیم کر لیا۔ بڑے بڑے صحابۂ کرامؓ میں سے شاید کسی نے بھی کوئی ثبوت اور معجزہ طلب نہیں کیا، جو لوگ معجزے طلب کرتے تھے، جن کو معجزے دکھائے بھی گئے۔ اُن میں سے شاذ و نادر ہی کوئی مسلمان ہوا ہو۔ ابولہب، ابوجہل، عبداللہ بن ابی سمیت بڑے بڑے سردار اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس لئے معجزے کے حوالے سے تین قسم کے انسانوں کا متکلمین نے تذکرہ کیا ہے، کچھ انسان تو وہ ہوتے ہیں جو ہر نبی کے ساتھ سابقون الاولون میں شمار ہوتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سعید روح اور پاکیزہ سوچ لے کر آتے ہیں، جو طبعِ سلیم رکھتے ہیں، جن کی عقل عقلِ سلیم ہوتی ہے، اور وہ نبی کی شخصیت اور کردار ہی کو اصل معجزہ سمجھتے ہیں، اُن میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ نبی کے اعلیٰ مقام اور مرتبے کا اندازہ کر سکیں۔ اُس کے کردار اور شخصیت کی بنیاد پر یہ فیصلہ کر سکیں کہ یہ شخص غلط بیانی نہیں کر سکتا۔ اور جو دعویٰ اس نے کیا ہے وہ مبنی بر صداقت اور مبنی برحق ہے، اس لئے جیسے ہی وہ نبی کی بات سنتے ہیں تو دعوت کو قبول کر لیتے ہیں، دوسرے وہ لوگ ہیں جو اندر سے دشمنی اور نفرت کا رویہ رکھتے ہیں، اور چاہے ان کو ہزار معجزے دکھائے جائیں وہ کبھی بھی نبوت کی صداقت پر ایمان نہیں لاتے۔ کسی تعصب کی وجہ سے، کسی ذاتی مفاد کی وجہ سے، کسی دشمنی کی وجہ سے، غرض کسی بھی وجہ سے اُن کے لئے معجزے کا ہونا نہ ہونا بے کار ہے، لیکن ان دونوں کے علاوہ انسانوں کا ایک طبقہ ایسا ہوتا ہے جس کی خاصی بڑی تعداد ہوتی ہے جو متردد اور متأمل ہوتا ہے، اور معجزہ دیکھنے کے بعد ہلکا سا پردہ جو اُس کی آنکھ پر پڑا ہوتا ہے وہ اُٹھ جاتا ہے، اور وہ نبوت کی صداقت پر ایمان لے آتا ہے۔ یا وہ لوگ جو اسلام میں داخل ہو چکے ہیں لیکن ایمان کی کسی کمزوری کی وجہ سے تذبذب کا شکار ہوتے ہیں، معجزہ دیکھ کر اُن کے ایمان میں پختگی آ جاتی ہے، اور وہ گمراہ ہونے یا کسی شک میں مبتلا ہونے سے بچ جاتے ہیں، اس لئے معجزے کے اصل مخاطبین یہ تیسرے طبقے کے لوگ ہیں، جو ایمان کی کمزوری کا علاج معجزے سے کرتے ہیں، یا ان کے عقل و شعور پر جو ہلکا سا پردہ پڑا ہوتا ہے معجزہ دیکھ کر وہ پردہ اُٹھ جاتا ہے، لیکن جو اصل سعید اور سمجھ دار لوگ ہوتے ہیں، اُن کے لئے اصل معجزہ پیغمبر کی شخصیت اور کردار اور خود ماننے والے کی سلامت طبع ہے، انسان از خود سلیم الطبع ہو تو اُس

کے اندر سے روح اور قلب گواہی دیتے ہیں کہ کون سچا ہے؟ کون جھوٹا ہے؟ ہر انسان اپنی ماں کو کسی ظاہری قانونی دلیل کے بغیر ماں مانتا ہے، باپ کو باپ مانتا ہے، ڈی این اے ٹیسٹ تو اب ہونے لگے ہیں، وہ بھی ہر ایک کے بس میں نہیں ہوتے، لیکن اندر سے ایک سلیم الفطرت انسان کی روح اور دل گواہی دیتا ہے کہ یہ میرے ماں باپ ہیں۔ اور وہ ان کو ماں باپ مانتا ہے۔ اس کی کوئی عقلی دلیل نہیں ہوتی، کوئی ماں باپ سے ماں باپ ہونے کا دستاویزی ثبوت نہیں مانگتا، گواہی نہیں مانگتا۔ اور اگر کسی سے اُس کے ماں باپ کے ماں باپ ہونے کی گواہی مانگ لی جائے تو وہ شاید لڑنے مرنے پر تیار ہو جائے، اس لئے کہ اس کے سینے کے اندر قلبِ سلیم ہے، اس کے سامنے اس محترم شخص اور محترم خاتون کا مبنی بر محبت پورا طرزِ عمل اور مبنی بر شفقت رویہ ہوتا ہے، جس کی بنیاد پر وہ اُن کو ماں باپ مانتا ہے، اسی بنیاد پر ایک سعید روح پیغمبر کو پیغمبر مانتی چلی آ رہی ہے۔ اور ماننے والے اس زمانے میں بھی مانتے تھے، آج بھی مانتے ہیں، اسی لئے انبیاء علیہم السلام نے سب سے پہلے اپنی شخصیت و کردار کو اپنی نبوت کی دلیل کے طور پر پیش کیا:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ (۱۸)

میں ایک طویل عمر تمہارے درمیان رہا ہوں۔ میرا پورا کردار اور رویہ تمہارے سامنے ہے، تم اس کو دیکھ سکتے ہو۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بہت سے معجزے پیش فرمائے، لیکن آپ ﷺ نے کسی سوال کے جواب میں اگر معجزہ بیان کیا تو عموماً قرآنِ پاک ہی کو بیان کیا، اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً جو معجزے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ظاہر ہوئے، وہ کسی خاص موقع پر کسی خاص سیاق وسباق میں، کسی خاص ماحول میں اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر جاری کر دیئے۔ معجزہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ پیغمبر کی طرف سے نہیں ہوتا۔ پیغمبر جب چاہے معجزے کو تخلیق کر دے، یہ نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ اُن کی ذات پر ظاہر کر دیتا ہے۔ معجزے کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، پیغمبر نہیں ہے۔ پیغمبر اس کا مظہر ہے، پیغمبر اس کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔

قرآنِ پاک کے اندر کچھ ایسے پہلو ہیں، جن کی وجہ سے اسے ہمیشہ معجزہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآنِ پاک میں ماضی کے بعض واقعات کی خبر دی گئی ہے۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں نہیں تھے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ (۱۹)

سابقہ مذاہب اور انبیا علیہم السلام کی بہت سی تفصیلات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں نہیں

تھیں۔ کفارِ مکہ اور قریش بھی اُن سے متعارف نہیں تھے۔ اس لئے جب وہ تفصیلات حضور ﷺ نے قرآن میں بتائیں تو اس کے ساتھ یہ یاد دلایا گیا کہ یہ غیب کی وہ خبریں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی ہیں۔ اسی طرح آئندہ آنے والی بعض خبریں بھی قرآنِ پاک میں دی گئی ہیں۔ جو اسی طرح سامنے آئیں، جن میں رومیوں کی کامیابی کی خبر ایک مشہور خبر ہے، جس کی طرف تمام مفسرینِ قرآن نے اشارہ کیا ہے۔ (۲۰)

پھر شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں جو کامل و متکامل شریعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں، جس کا مبنی بر عقل ہونا، زندگی کے ہر پہلو کے لئے رہنما خطوط فراہم کرنا، خود اپنی جگہ ایک معجزہ ہے۔ یوں تو پوری شریعت ایک معجزہ ہے، لیکن شریعت کا قانونِ میراث ایک ایسا معجزہ ہے، جس کی مثال خود احکامِ شریعت میں بھی نہیں ملتی۔ قرآنِ پاک کی صرف بتیس آیتوں میں چند بنیادی احکام بیان ہوئے ہیں، جن سے کام لے کر فقہائے کرام نے اس قدر تفصیلی احکام مرتب کئے ہیں جن کی نظیر دوسرے قوانین وراثت میں نہیں ملتی۔ دورِ جدید میں بعض حضرات نے کمپیوٹر کی مدد سے کئی کروڑ صورتیں اور ان کے احکامات ان آیات کی روشنی میں متعین اور واضح کئے ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت جسے شاہ ولی اللہ نے بجا طور پر معجزہ قرار دیا ہے، واقعتاً ایک معجزہ ہے۔

یہ وہ معجزات ہیں جن کو ہم عقلی یا علمی معجزات کہہ سکتے ہیں، ان کے علاوہ لاتعداد حسی اور ظاہری معجزات ہیں جن کو لوگوں نے اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھا، اُن کی تعداد کے بارے میں سیرت نگاروں میں بہت کچھ بحث ہوتی رہی ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے الخصائص الکبریٰ میں ایک ہزار معجزات کی تفصیل بیان کی ہے۔ امام بیہقیؒ بھی ایک ہزار معجزات کے قائل ہیں، امام نوویؒ نے معجزات کی تعداد ۱۲سو قرار دی ہے، بعض دیگر سیرت نگاروں نے تین ہزار یا کسی نے ساڑھے تین ہزار کی تعداد بتائی ہے۔ یہ وہ معجزات ہیں جو مختلف واقعات اور احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔ ان میں بعض واقعات ایسے بھی ہیں جن کے معجزے ہونے یا نہ ہونے میں علمائے سیرت کا اختلاف ہے، ایک واقعہ خاص انداز سے پیش آیا۔ کسی شخص نے اس کو ایک نظر سے دیکھا تو اسے معجزہ سمجھا، دوسرے سیرت نگار نے مختلف نظر سے دیکھا تو اسے عام واقعہ سمجھا، معجزہ قرار نہیں دیا۔ اس اعتبار سے بھی تعداد میں فرق ہوسکتا ہے۔ ان میں سے چند معجزات کی مثالیں بیان کرتا ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بڑا معجزہ جس کو صحابۂ کرام رضوان اللہ اجمعین نے محسوس کیا اور مختلف احادیث میں بیان ہوا ہے وہ آپ ﷺ کا مستجاب الدعا ہونا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو دعا

کرتے تھے وہ اُسی طرح پوری ہوجایا کرتی تھی۔ یہ بات نہ صرف صحابۂ کرامؓ کے علم میں تھی، بلکہ مخالفین کے علم میں بھی تھی۔مخالفین میں عتبہ بن ربیعہ جو بڑا مخالف اور سردارِ قریش تھا، وہ ایک مرتبہ کفارِ مکہ کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرنے آیا، وہ حضور ﷺ سے کوئی معاملہ کرنا چاہتا تھا، اُس نے اپنی بات کہی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس سے کہا کہ چچا! آپ کو جو کہنا تھا وہ کہہ چکے؟ اُس نے کہا ہاں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں سورۂ حم السجدہ پڑھنی شروع کی، وہ خاموشی کے ساتھ سنتا رہا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت پر پہنچے:

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ط (۲۱)

اگر یہ لوگ ماننے سے انکار کریں تو تم یہ کہہ دو کہ میں تمہیں اسی طرح کی کڑک سے ڈراتا ہوں جیسی عاد وثمود پر نازل ہوئی تھی۔

تو عتبہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ بھتیجے ایسا نہ کہو، تم جو کہتے ہو وہ ہوجاتا ہے، اپنی قوم کا برا نہ چاہو۔ (۲۲) یہ بات کفارِ مکہ کو بھی معلوم تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مستجاب الدعوات ہیں، اور جو دعا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلتی ہے وہ پوری ہوجاتی ہے۔اس کی درجنوں مثالیں سیرت کے عام ادب میں موجود ہیں، عام کتبِ حدیث میں محفوظ ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مختلف حکمرانوں کو نامۂ مبارک بھیجے، تبلیغی خطوط ارسال کیے، کسی نے مثبت جواب دیا، کسی نے احترام کے ساتھ اسے وصول کیا، کسی نے جواباً احترام کا خط لکھا، سب سے زیادہ بدبخت شخص شہنشاہِ ایران کسریٰ یا خسرو پرویز تھا، جس نے نامۂ مبارک کو پھاڑ کر پھینک دیا۔اور اُن صحابیؓ کو غصے سے اپنے دربار سے نکال دیا، جو وہ خط لے کر گئے تھے۔صحابیٔ رسولؐ نے آکر بتایا کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک کسریٰ کو دیا تو اُس نے نامۂ مبارک کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے پھینک دیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللھم مزق ملکہ۔ (۲۳)

اے اللہ! تو اس کی حکومت کے ٹکڑے ٹکڑے کردے۔

یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سن ۶ ہجری کے آخر میں فرمائی تھی۔اور حضور ﷺ کی وفات سے پہلے ہی اُس کو اُس کے بیٹے نے قتل کردیا، بیٹے کو پھر اور لوگوں نے قتل کردیا۔پھر بیٹی کو تخت پر بٹھایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے تک کئی حکمران اس تخت پر آئے، اور حضور صلی اللہ علیہ

وسلم کے جانشینوں نے دس سال کے اندر اندر اس کی سلطنت کو ختم کر دیا اور وہ اسلام کا حصہ بن گئی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جب ہجرت کر کے آئے تو اپنا سارا سامان مکہ مکرمہ میں چھوڑ آئے تھے، وہ مدینے آئے تو تنہا آئے تھے، اُن کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اُن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انصاری کا بھائی بنا دیا۔ انصاری نے اُن سے کہا کہ آپ میری آدھی زمین، آدھا گھر، سب چیزیں آدھی آدھی لے لیں، میری دو بیویاں ہیں، جس کو آپ کہیں میں طلاق دے دیتا ہوں، عدت پوری ہونے کے بعد آپ نکاح کر لیں۔ اُنہوں نے کہا کہ مجھے کچھ نہیں چاہئے، آپ مجھے صرف بازار کا راستہ بتا دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر کہا کہ میں تجارت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے اللہ! عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی تجارت میں برکت عطا فرما۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ کہتے ہیں کہ میری تجارت میں اتنی برکت ہوئی کہ اگر میں کہیں سے پتھر بھی ہٹاتا تھا تو مجھے خیال ہوتا تھا کہ یہاں سے سونا نکل آئے گا۔ اور چند برس کے اندر اندر مدینہ منورہ کے چند دولت مندترین افراد میں اُن کا شمار ہونے لگا تھا۔ اور کوئی ایسا کاروبار انہوں نے نہیں کیا۔ جس میں دوسروں سے کئی کئی گنا نفع ان کو نہ ہوا ہو۔ حتیٰ کہ صحابۂ کرامؓ اپنی رقم اُن کو دیا کرتے تھے کہ آپؓ ہماری طرف سے اپنے کاروبار میں لگا دیں، اس لئے کہ جتنا نفع آپ کے کاروبار میں ہوتا ہے، اتنا کسی اور کے کاروبار میں نہیں ہوتا۔ (۲۴)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ جب اسلام قبول کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو اُن کی عمر ۱۳ سال تھی۔ تین سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں رہے۔ ۱۶ سال کے تھے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے۔ اُن کے لئے حضور ﷺ نے دعا فرمائی کہ:

اللّٰھم علمہ التاویل وفقھہ فی الدین واجعلہ من اھل الایمان۔ (۲۵)

اے اللہ! انہیں قرآن کا علم سکھا، اور دین میں سمجھ عطا فرما اور انہیں اہل ایمان میں سے بنا۔

صحابۂ کرامؓ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو یہ حیثیت حاصل ہوئی کہ خود بڑے بڑے صحابۂ کرامؓ ان سے راہنمائی لیا کرتے تھے، اور مشورہ کیا کرتے تھے۔ حدیث، تفسیر، فقہ، سیرت، کلام، عقیدہ، عربی ادب، عربی ادب کی نزاکتیں، اُس زمانے کا کوئی علم وفن ایسا نہیں ہے جس میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سند کی حیثیت نہ رکھتے ہوں، اور ان کے اقوال وارشادات اُس زمانے کی ان علوم وفنون کی کتب میں موجود نہ ہوں۔

ایک صحابیؓ نے آ کر شکایت کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مدینہ منورہ میں بارش نہیں ہوئی اور ہمارے سارے کھیت اور باغات سوکھ رہے ہیں، مدینہ منورہ بارانی علاقہ ہے، وہاں دریا نہیں ہیں، دو ایک برساتی نالے ہیں، جب بارش ہوتی ہے تو ان میں پانی آتا ہے، ورنہ پانی نہیں آتا۔ سارا دارومدار ایک دو کنوؤں پر تھا۔ یا بارش پر تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت خطبہ ارشاد فرمارہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے کے دوران ہی دعا کی، صحابہؓ کہتے ہیں کہ مدینہ منورہ کے آس پاس بھی بارش کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا ختم نہیں کی تھی کہ بادل آگئے اور اتنی کثرت سے برسنے شروع ہوئے کہ ابھی نماز پڑھ کر لوگ نکلے نہیں تھے کہ مدینہ سارا جل تھل ہوگیا۔ اب انہی صحابیؓ نے اُٹھ کر کہا کہ یارسول اللہ ﷺ! اتنی بارش میں تو ہمارے درخت ضائع ہوجائیں گے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللّٰھم حوالینا ولا علینا اے اللہ! ہمارے چاروں طرف برسا ہمارے اوپر نہ برسا۔ صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے باہر نکل کر دیکھا تو بادل چھٹ گیا، مدینے کے اُوپر آسمان نکل آیا۔ بادل چاروں طرف ہوگیا۔ اب پہاڑوں پر بارش ہورہی تھی۔ برساتی نالوں میں پانی بہہ رہا تھا اور درختوں اور کھیتوں کے اوپر جو بارش ہورہی تھی وہ بند ہوگئی۔

حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی زبانِ مبارک سے بہت سی پیشین گوئیاں بھی جاری ہوئیں۔ ان پیشین گوئیوں میں سے قرآنِ پاک میں سورۂ روم کی پیشین گوئی جس کا ذکر ہوچکا ہے وہ تو الگ ہے، لیکن جس زمانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیشین گوئی فرمائی تھی، اُس زمانے میں مسلمان مدینے میں بھی محفوظ نہیں تھے۔ خود منافقین نے طعنہ دیا تھا کہ اپنے گھر جا نہیں سکتے، بیت الخلا جاتے ہیں تو ڈر لگتا ہے، اور آپ ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی:

لتفتحن مدینہ۔ قیصر، فلنعم الامیر امیرھا ولنعم الجیش ذلک الجیش۔ (۲۶)

تم قیصر کے دارالحکومت کو فتح کروگے اور وہ سردار کتنا ہی اچھا ہوگا جو اُسے فتح کرے گا، اور وہ لشکر کتنا اچھا ہوگا جو اسے فتح کرنے کے لئے جائے گا۔

۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں استنبول فتح ہوا اور مجھے نہیں معلوم کہ اُس وقت سلطان محمد فاتح کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی جب اُس کو بتایا گیا ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں بہترین امیر قرار دیا تھا۔ اور تمہارے لشکر کو بہترین لشکر قرار دیا تھا۔ جب سلطان محمد فاتح سے یہ کہا گیا کہ وہ بہتر

امیر ہیں جس کی بشارت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی تو اُس نے کہا کہ نہیں میں بہترین امیر نہیں ہوں، بہترین امیر حضرت ابوایوب انصاریؓ ہیں جو پہلے یہاں تشریف لائے تھے۔ جن کا یہاں مزار ہے۔ اُس نے اُن کے مزار پر حاضری دی۔ اور اُن کو فاتحِ استنبول قرار دیا۔ اور آج کل جس علاقے میں اُن کا مزار ہے، اُسے فاتح کہتے ہیں، اور حضرت ابوایوبؓ کو سلطان ایوب کہتے ہیں۔

ایک جدید سیرت نگار نے بہت اچھا لکھا ہے، اُس نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی گواہی جمادات نے بھی دی ہے، نباتات نے بھی دی، کائنات نے بھی دی، سیارگانِ فلک نے بھی دی۔ پھر ایک ایک کر کے معجزات کو ان عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تشریف لے جا رہے تھے تو حضرت علیؓ نے کسی واقعے کو بیان کرتے ہوئے ذکر کیا کہ فلاں چٹان کے قریب یہ بات ہوئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں میں اُس چٹان کو پہچانتا ہوں، نبوت سے پہلے وہ چٹان مجھے سلام کیا کرتی تھی، مجھے اُس سے آواز آیا کرتی تھی السلام علیک یا محمد۔ یہ روایت صحیح بخاری کے علاوہ اور جگہوں پر بھی نقل ہوئی ہے، اسطوانہ حنانہ کی روایت سے ہم سب واقف ہیں، مدینہ منورہ میں آج بھی وہ موجود ہے، اُس پر لکھا ہوا ہے، اسطوانہ حنانہ، جس ستون سے ٹیک لگا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دیا کرتے تھے، جب منبر بن گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہوئے تو اس ستون سے رونے کی آواز آئی، جیسے کوئی ہچکی لے کر روتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جا کر اُس کو تسلی دی تو وہ اسی طرح سے خاموش ہو گیا جیسے روتے ہوئے بچے کے سر پر ہاتھ رکھا جائے اور اُسے تسلی دی جائے تو وہ خاموش ہو جاتا ہے۔ (۲۷)

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبلِ اُحد پر تشریف فرما تھے۔ آپ ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم بھی تھے، وہ جگہ بھی میں نے دیکھی ہے اور آج بھی موجود ہے، وہ پتھر بھی موجود ہے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ جبلِ اُحد تھوڑا سا ہلا۔ اور ابھی بھی وہاں پر زلزلے کے آثار ہیں، آپ ﷺ نے اپنا قدمِ مبارک اُس پر مار کر کہا کہ ٹھہر جا، تجھ پر ایک نبی ہے، ایک صدیق ہے اور ایک شہید ہے، یہ حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کی خبر بھی ہے، پھر وہ ٹھہر گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف فرما رہے۔ (۲۸)

ترمذی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی سفر سے واپس آ رہے تھے، راستے میں کوئی بدو ملا، اُس بدو کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دی۔ اُس نے کہا کہ آپ کوئی ثبوت دے

سکتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں اس کھجور کے خوشے کو بلالوں تو کیا تم میری نبوت کی شہادت دو گے؟ اس نے کہاہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے درخت کو آواز دی، وہ درخت سے اتر کر قریب آیا۔ اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے وہ واپس چلا گیا۔ بدوی اسلام لے آیا۔ (۲۹) امام ترمذی نے اسے حدیثِ حسن قرار دیا ہے، اوراس کو مستند سمجھا ہے۔

ابوطلحہ انصاریؓ کے پاس ایک گھوڑا تھا۔ جو بہت از کار رفتہ تھا۔ اُس کو نہ وہ بیچ سکتے تھے کہ کوئی اس کوخریدتا ہی نہیں تھا۔ اُسے مارڈالنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کا کیا کریں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر شکایت کی کہ اس طرح کا معاملہ ہے، بیچتا ہوں تو کوئی اسے خریدتا نہیں ہے، رکھتا ہوں تو کھلانا پڑتا ہے، کسی کام کا نہیں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس لے کر آنا۔ وہ گھوڑا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے، آپ ﷺ نے لگام ڈلوائی، اُس پر سوار ہو کر کہیں چلے گئے، تھوڑی دیر بعد واپس آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان فرسک لو جدناہ بحراً۔ (۳۰)

تمہارے گھوڑے کو تو ہم نے دریا پایا۔

اس کے بعد وہ مدینے کے تیز رفتار ترین گھوڑوں میں سے ایک گھوڑا تھا۔ اور اس کا لقب ہی بحر ہوگیا تھا۔ ایسی مثالیں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے پانی کی کثرت ہوگئی، مردہ کنویں سے پانی نکل آیا، تھوڑا پانی ہزاروں افراد کے لئے کافی ہوگیا۔ ایسے درجنوں واقعات ہیں، اور بہت سے غزوات میں ایسا ہوا ہے، بار ہا ایسا ہوا ہے، (۳۱) ابوقتادہ بن نعمانؓ جن کے پڑپوتے سیرت نگار تھے، غزوۂ اُحد میں اُن کی آنکھ پر تیر لگا، لٹک گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آ کر دکھایا، آنکھ لٹکی ہوئی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دوبارہ اپنی جگہ پر رکھ دی اور کہا کہ ٹھیک ہوجائے گی، پھر وہ اُن کی تیز ترین آنکھ تھی، اوراتنی صحت مند تھی کہ دوسری آنکھ کو شکایت ہوتی رہی، بیماری آتی رہی، اس آنکھ میں کبھی کوئی بیماری نہیں آئی۔ (۳۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک توشہ دان دیا تھا، اور کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس میں برکت دے گا، اس کو اپنے پاس رکھنا، اُن کی جیب میں اوراُن کے پاس وہ توشہ دان رہتا تھا، اُس میں کھجوریں تھیں، جس سے نکال نکال کر وہ کھاتے رہتے تھے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کھاتے رہے، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی پوری زندگی کھاتے رہے، حضرت عمر فاروقؓ کے عہد کے دس

ساڑھے دس سال کھاتے رہے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ساڑھے بارہ سال کھاتے رہے، جس دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی، افراتفری ہوئی تو اُن کا توشہ دان گم ہوگیا، اُن کا ایک شعر ہے کہ لوگوں کو تو ایک غم ہے، مجھے دو غم ہیں۔ لوگوں کا غم یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ شہید ہوگئے۔ دوسرا غم یہ ہے کہ میرا توشہ دان بھی گم ہوگیا۔ (۴۳)

اصحابِ صفہ جن کی تعداد عموماً ستر، اَسّی کے قریب ہوا کرتی تھی۔ اکثر و بیشتر اُن کے پاس وسائل نہیں ہوتے تھے، صحابۂ کرام اُن کو لے جاتے تھے، ایک مرتبہ کئی روز گزر گئے۔ ایسا کوئی بندوبست نہیں ہوسکا۔ اصحابِ صفہ ضرورت مند تھے۔ اتفاق سے ایک صحابیؓ دودھ کا ایک پیالہ لے کر آئے، حضرت ابوہریرہؓ وہاں موجود تھے، وہ کہتے ہیں کہ میں کئی روز سے فاقے سے تھا، میں یہ دیکھ کر خوش ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ دودھ کا پیالہ مجھے بھی دیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اصحابِ صفہ کو بلا کر لے آؤ۔ ابوہریرہؓ نے سوچا کہ مجھے کیا ملے گا؟ وہ اصحابِ صفہ کو بلا کر لے آئے، وہ ستر آدمی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک کو دو، اُنہوں نے دیا، اچھی طرح سے پلایا، دوسرے کو دیا، تیسرے کو دیا، ستر کے ستر آدمی سیر ہوگئے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا کہ بقیت انا وانت، میں اور تم ہی رہ گئے ہیں؟ پھر ابوہریرہؓ سے کہا کہ پیو، اُنہوں نے کہا کہ میں نے اچھی طرح سے پی لیا، آپ ﷺ نے فرمایا اور پیو، اور پیو، جب میں مزید پینے کے قابل نہ رہا تو میں نے کہا کہ میں بالکل نہیں پی سکتا، میں سیر ہوگیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ مجھے دے دو، پھر بقیہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پی لیا۔ (۴۴)

حضور علیہ الصلاۃ والسلام غزوۂ خندق میں تھے، ایک صحابیؓ نے شکایت کی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! بھوک سے میں نے پیٹ پر پتھر باندھ رکھا ہے، پیٹ اتنا خالی ہے کہ میں سیدھا کھڑا نہیں ہوسکتا۔ تو چادر پر پتھر لپیٹ کر پیٹ پر باندھ لیا ہے۔ حضور ﷺ نے اپنا بطنِ مبارک دکھایا، وہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے، یہ منظر دیکھ کر ایک صحابی حضرت ابوطلحہ انصاریؓ، حضرت انسؓ کے والد جلدی سے اپنے گھر گئے اور ایک چھوٹا سا بکری کا بچہ تھا اُسے ذبح کیا اور بیگم سے کہا کہ جلدی سے کھانے کا انتظام کرو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر آتا ہوں، میں نے یہ منظر دیکھا ہے۔ پھر حضور ﷺ سے کہا کہ میرے ساتھ چلیں اور کھانا کھائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے بھی لوگ موجود تھے، سب سے کہا کہ چلو ابوطلحہؓ کے ہاں دعوت ہے۔ اَسّی آدمی حضور ﷺ کے ساتھ ہوگئے۔ ابوطلحہ گھبرا گئے اور جا کر بیگم سے کہا کہ کھانا تو تین چار آدمیوں سے زیادہ کا نہیں ہے، اور حضور ﷺ کے ساتھ تو اَسی آدمی ہیں، بیگم نے کہا کہ آپؐ

نے کہہ دیا تھا کہ کتنا بندوبست ہے؟ اُنہوں نے کہا کہ ہاں میں نے تو کہہ دیا تھا کہ ایک بکری کا بچہ میں نے ذبح کیا ہے، اُنہوں نے کہا کہ جب آپ نے کہہ دیا تھا تو حضور ﷺ خود ذمے دار ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لانے کے بعد کہا کہ سالن کو ڈھک دینا، کھولنا مت اور روٹیاں پکاتی جاؤ اور ایک ایک کر کے دیتی جاؤ۔ جتنے لوگ تھے اُن کو بٹھا دیا کہ دس دس افراد آتے جائیں اور کھاتے جائیں، دس دس افراد آتے گئے اور کھاتے گئے، اندر سے اُنہوں نے کہا کہ ایک اور پکانے والی کو بلالو پھر ایک اور پکانے والی آ گئی، دو خواتین روٹیاں بناتی گئیں، اندر سے ڈھکے ہوئے برتن میں سے گوشت نکال کر بھیجتے رہے، اور جب تمام اَسی آدمی سیراب ہو گئے تو آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ خانہ کے ساتھ کھانا کھایا۔ (۳۵)

غزوۂ خندق کے علاوہ دیگر غزوات میں بھی اس طرح کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں، جنہیں بیان کیا جائے تو بات لمبی ہو جائے گی۔ یہ وہ چند مثالیں ہیں جو صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

ایک اور اہم بات جو کلامیاتِ سیرت سے تعلق رکھتی ہے وہ ہے، جس کی طرف علامہ شبلیؒ نے اشارہ کیا ہے، علامہ شبلیؒ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگلے زمانے میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی۔ علمِ کلام سے اسے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن آج بہت سے ایسے مسائل جو دراصل تاریخ کے ہیں، لیکن اُن کا تعلق علمِ کلام سے بھی ہو گیا ہے، اس لئے کہ لوگوں نے ان کے بارے میں شکوک کا اظہار کیا، تامل کا اظہار کیا، ان پر بحثیں شروع ہو گئیں، یوں وہ تاریخ کا مسئلہ نہیں رہا علمِ کلام کا مسئلہ بن گیا۔ توحید پر تو کم لوگ اعتراض کرتے ہیں، لیکن زیادہ اعتراض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیتِ مبارکہ پر، آپ ﷺ کے اخلاق و عادات پر، آپ ﷺ کے خاندان پر اور اس طرح کی چیزوں پر اعتراضات ہیں، جن کا جواب مسلمان علما نے دیا ہے، ان جوابات پر اعتراضات ہوئے، جن کے بعد جواب الجواب دیئے گئے۔ اس طرح سے یہ بحث جاری ہے، شاید آئندہ بھی جاری رہے۔ اس طرح بہت سے ایسے مسائل جو دراصل کلامی مسائل نہیں تھے، اس بحث مباحثے کی وجہ سے کلامی مسائل بن گئے۔

کچھ کلامی مسائل ایسے تھے جو دراصل کلامی نہیں تھے لیکن خود مسلمانوں میں بعض مباحث کی وجہ سے اُن کی حیثیت کلامی مسائل کی بن گئی۔ مثلاً، حضرت ابو طالب اسلام لائے یا نہیں؟ یہ ویسے تو ایک تاریخی مسئلہ ہے، عبدالمطلب جن کا اسلام سے پہلے انتقال ہو گیا، اور اُن کے آبا و اجداد کی حیثیت کیا ہے؟ ویسے تو یہ سوال ہم میں سے کسی سے روزِ قیامت نہیں پوچھا جائے گا کہ عبدالمطلب، ہاشم اور عبد مناف کا درجہ کیا تھا؟ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، نبوت سے پہلے یہ حضرات تشریف فرما تھے، وہ کس عقیدے پر تھے، کس

مذہب پر تھے، ہم نہیں جانتے۔ لیکن بعض لوگوں نے یہ سوال اُٹھایا، جس پر بحثیں شروع ہوئیں۔ دلائل اور جوابی دلائل دونوں طرف سے آنے شروع ہوئے۔ یوں یہ مسئلہ متنازعہ اور کلامیات کا مسئلہ بن گیا۔ حضرت ابوطالب کے بارے میں اس مسئلے میں فرقہ وارانہ رنگ بھی پیدا ہوگیا۔ مسلمانوں کے ایک گروہ نے اصرار کیا کہ اُنہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ دوسرے گروہ نے اصرار کیا کہ اُنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ حالانکہ یہ محض تاریخ کا مسئلہ ہے، کسی شخص نے خاص دور میں اسلام قبول کیا یا نہیں، یہ اس کا اور اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے، اگر انہوں نے اسلام قبول کرلیا ہو جیسا کہ ہر مسلمان کا دل چاہتا ہے کہ واقعی ایسا ہی ہوا ہو تو میری اور آپ کی دینی ذمے داریوں میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور اگر خدانخواستہ وہ رائے صحیح ہے کہ اُنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا، تو بھی ہماری اور آپ کی ذمے داریاں تو وُہی رہیں گی جواب ہیں، لیکن یہ مسئلہ بعض لوگوں نے حساس قرار دے دیا اور اس پر لمبی بحثیں شروع ہوگئیں۔

اسی طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کا معاملہ ہے، بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ آپ ﷺ کے والدین کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کیا اور اُنہوں نے اسلام قبول کیا، اور صحابیت کے مقام پر فائز ہوئے اور پھر دوبارہ فوت ہوگئے۔ اگر ایسا ہوا ہو تو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں ہے، بشرطیکہ ایسا ہونا ثابت ہو۔ اور اس اصول روایت کے مطابق ثابت ہو جو مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہے، پھر اللہ تعالیٰ کی مشیت اور سنت کسی کو زندہ کرنے کی نہیں رہی۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو یہ بات بہت کثرت سے مشہور اور معروف ہوتی۔ مستند احادیث میں آئی ہوتی۔ بعض لوگ اس کے قائل ہیں، انہوں نے اس پر کتابیں لکھی ہیں۔ علامہ سیوطیؒ بھی اس کے قائل ہیں، انہوں نے بھی اس پر کتاب لکھی ہے، یہ اور اس طرح کے کئی مسائل بنیادی طور پر تاریخی مسائل تھے، لیکن وہ تاریخی مسائل نہیں رہے، کلامی مسائل بن گئے۔

کچھ اور مسائل ایسے ہیں، جو ایک اعتبار سے فقہی ہیں، لیکن ایک اعتبار سے وہ کلامی مسئلہ بھی ہے، اور خاص طور پر مغربی مستشرقین نے ان پر بڑا زور دیا ہے، انہیں اُچھالا ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کی تعداد ہے، اسلام سے پہلے تعدادِ ازواج کی کوئی قید یا پابندی نہیں تھی۔ بائبل میں لکھا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک ہزار بیویاں تھیں۔ بائبل ہی میں لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی ننانوے بیویاں تھیں۔ اسی طرح سے بائبل میں مختلف انبیا کی ازواج کی مختلف تعداد لکھی ہے، ایک ہزار، دو ہزار، تین ہزار، چار سو، پانچ سو۔ غرض کہ بیویوں کی کوئی تعداد متعین نہیں تھی۔ حتیٰ کہ نظری طور پر عیسائی بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جنہوں نے دنیا سے جانے سے پہلے شادی نہیں کی تھی،

جتنی نن Nuns ہیں یہ سب اُن کی بیویاں ہیں، اور ہر نن بھی اپنے آپ کو اس کے لئے عقیدتاً تیار رکھتی ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں تو یہ اُن کی بیویاں بن جائیں۔ ماضی میں کتنی ننیں رہی ہیں، آئندہ کتنی ننیں اور ہوں گی۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ان کی تعداد بہرحال لاکھوں میں تو ضرور ہوگی۔ یہ سب حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب ہیں، کم از کم نظری طور پر عیسائیوں میں سے بہت سے لوگ ان کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بیویاں سمجھتے ہیں، اس لئے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعدادِ ازواج کے مسئلے پر سابقہ مذاہب کے پیروکاروں کو تو اعتراض کرنا زیب نہیں دیتا۔ لیکن اُنہوں نے اعتراض کیا ہے، اس کا جواب عام طور پر علمائے کرام یہ دیتے چلے آئے ہیں کہ یہ خصائصِ نبوت میں سے ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اس کی خاص اجازت دی تھی۔ لیکن یہ سوال پھر بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ خاص اجازت کیوں دی؟ پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خاص اجازت کی بات مسلمانوں کے لئے تو قابل قبول ہوسکتی ہے، غیر مسلم پھر بھی اعتراض کرے گا۔ جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی نہیں مانتا، اس کے لئے تو قرآن کی اجازت کوئی معنیٰ نہیں رکھتی۔ اس کا جواب دینے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے دو باتیں پیشِ نظر رکھی جائیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ چار ازواج کی تحدید کی آیات کب نازل ہوئیں؟ قرآنِ پاک میں جن آیات میں چار ازواج کی تحدید ہے وہ کب نازل ہوئیں؟ پھر یہ دیکھا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار کی تحدید کرنے والی آیات نازل ہونے کے بعد کوئی نکاح فرمایا یا نہیں؟ ایک عام رائے یہ ہے کہ چار کی تحدید سن سات کے لگ بھگ نازل ہوئی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آخری نکاح فرمایا تھا وہ بھی سن سات ہجری میں فرمایا تھا۔ اگرچہ حتمی طور پر اس تاریخ کا ابھی تعین نہیں ہوا کہ ان میں پہلے کون سا واقعہ ہوا اور بعد میں کون سا؟ دوسری بات جو پیشِ نظر رکھنی چاہئے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کو ۵ ہجری میں مسلمانوں کی مائیں قرار دے دیا گیا تھا۔ اور یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ یہ مسلمانوں کی حقیقی ماؤں کی طرح ہوں گی۔

وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ؕ (۳۶)

یہ سب مسلمانوں کی محرم ہوں گی، ان کے لئے حضور ﷺ کے بعد کسی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہوگا، نہ کسی کے لئے ان سے نکاح کرنا جائز ہوگا۔ یہ سب مسلمانوں کے لئے ماؤں کے برابر ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چار کی تحدید آنے کے بعد اس حکم پر عمل فرماتے تو کیا کرتے؟ ایک صورت یہ ہوتی کہ ان میں سے کوئی سی چار کے علاوہ باقی کو طلاق دے دیتے۔ اور ان بقیہ

ازواج کو ازواجِ مطہرات ہونے کے شرف سے آپ خارج کردیتے۔ تو آپ یہ ناانصافی کس بنیاد پر کرتے؟ کن پانچ ازواج کو فارغ کرتے، کن چار کو نہ کرتے؟ یہ سوال پیدا ہوسکتا تھا۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض ازواج ایسی تھیں جو نسبتاً کم سن تھیں۔ جن کی عمر ۲۲، ۲۴، ۲۵ سال کے لگ بھگ تھی۔ تو وہ اتنی طویل زندگی تجرد کی حالت میں گزارتیں؟ یہ بھی ان کے ساتھ ناانصافی تھی۔ اس لئے قرآنِ پاک نے ایک درمیانی حل پیش کیا، جو سورۂ احزاب میں ہے کہ تم ان ازواج میں سے جس کو چاہو درِ دولت میں رکھو، جس کو چاہو ملتوی رکھو:

تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْیٓ اِلَیْکَ مَنْ تَشَآءُ ؕ (۳۷)

آپ ان بیویوں میں سے جس کو چاہیں الگ رکھیں اور جس کو چاہیں اپنے پاس رکھیں۔

اس آیت کی تفسیر میں متکلمینِ اسلام نے بہت سی بحثیں کی ہیں، لیکن اگر اس کو اس سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو بات واضح ہوجاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہرات کی دو قسمیں بنادیں۔ ایک وہ جن کو ایواء (درِ دولت میں رہنے) کا شرف بخشا، ایک وہ جنہیں ارجا کی منزل میں رکھا، اور ان کے باب میں بھی قرآنِ پاک نے اجازت دی کہ اگر آپ ان میں ردوبدل کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں، اس کے بعد فرمایا:

لَایَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْد۔ (۳۸)

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کسی اور عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے، گویا وہ پابندی جو بقیہ لوگوں پر تھی، ایک اعتبار سے حضور ﷺ پر بھی عائد ہوگئی، یعنی کسی نئی خاتون سے نکاح کرنا ناجائز ہوگیا۔ اور جو ازواجِ مطہرات اُس وقت حیات تھیں انہیں پہلے حضور ﷺ نے پیشکش کی کہ اگر تم چاہو تو میں تمہیں مال و دولت دے کر فارغ کردوں۔ اس کا ذکر بھی سورۂ احزاب میں ہے، ظاہر ہے کہ کوئی خاتون اس شرف کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ پھر بعض ازواجِ مطہراتؓ نے تجویز دی کہ ہم اپنا حق چھوڑنے کو تیار ہیں آپ ہمیں اس شرف سے خارج نہ کریں، حضرت سودہؓ کا اسمِ گرامی اس میں آتا ہے۔ بعد میں یہ ہدایت نازل ہوئی جسے اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضور ﷺ نے اختیار فرمایا۔ چنانچہ چار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایواء کے طور پر رہیں اور چار کو حضور ﷺ نے ارجا کی منزل میں رکھا۔ یہ ایک بحث ہے جو بعض حضرات نے کی ہے۔ اور اس کا تعلق بھی کلامیاتِ سیرت سے ہے، لیکن اس بارے میں قطعی رائے

دینا بڑا دشوار ہے، اس لئے کہ معاملہ اتنا نازک ہے اور غیر معمولی محترم شخصیت کا ہے، اس لئے حتمی طور پر کوئی بات کہنا مشکل ہے، یہ ایک رائے ہے، جو بعض حضرات نے دی ہے، یہ بات میں نے اس لئے عرض کی کہ یہ مسائل بھی کلامیاتِ سیرت میں شامل ہیں، جن کا تعلق سیرت سے ہے۔

ایک اور چھوٹی سی بات کہہ کر آج کی گفتگو ختم کرتا ہوں، وہ بھی ایک انفرادی رائے ہے، اور وہ حضرت امام جعفر صادقؒ سے منسوب ہے، حضرت امام جعفر صادقؒ بڑے فقیہ تھے، اہل بیت سے تعلق رکھتے تھے۔ قرآنِ حکیم میں جو آیا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا۔ (۳۹)

مسجدِ اقصیٰ کے بارے میں صحابۂ کرامؓ سے لے کر آج تک سب کا نقطۂ نظر عموماً یہی رہا ہے کہ مسجدِ اقصیٰ سے بیت المقدس کی مسجد مراد ہے، حضرت امام جعفر صادقؒ سے منسوب ہے کہ اس سے بیت المعمور مراد ہے، ساتویں آسمان والی مسجد۔ جن حضرات نے اس بات کی تائید کی ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی یہ بات درست ہے، وہ کہتے ہیں کہ قرآنِ پاک بڑا فصیح و بلیغ کلام ہے، اور کلامِ بلیغ کا ایک یہ شعبہ بھی ہے کہ اگر دو بڑے کارنامے ہوں، اس میں سے اگر چھوٹے کارنامے کا تذکرہ ہو، بڑے کارنامے کا تذکرہ نہ ہو تو یہ بلاغت کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت راتوں رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد الحرام مکۃ المکرّمۃ سے بیت المقدس لے گئی۔ یہ بھی بڑا کارنامہ اور بڑا معجزہ ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑا معجزہ یہ ہے کہ روئے زمین سے آسمانوں کی سیر کرائی، اور بیت المعمور تک لے جا کر دکھا دیا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ چھوٹے کارنامے کا یا بڑے معجزے کے نسبتاً چھوٹے پہلو کا تذکرہ تو ہو، بڑے پہلو کا تذکرہ نہ ہو۔ اس لئے ان کی رائے میں مسجدِ اقصیٰ سے وہ مسجد مراد ہے جو بیت المعمور کے نام سے مشہور ہے، پھر دوسری دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ قرآنِ پاک میں روم کو ادنیٰ الارض کہا گیا ہے، قریب کا علاقہ۔ اگر روم قریب کا علاقہ قرار دیا جاتا ہے جو بیت المقدس کے مقابلے میں خاصا دور واقع ہے تو جو چیز اس سے پہلے واقع ہے، اُسے دور کی مسجد کیسے کہا جا سکتا ہے؟ تیسری بات یہ کہی گئی ہے کہ اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ الذی بارکنا حولہ جس کے اطراف کو ہم نے بابرکت قرار دیا ہے، اس وقت تو وہاں بت پرستوں کا اور مشرکین کا قبضہ تھا۔ انبیا کی تصویریں لگی ہوئی تھیں، شریعت کی خلاف ورزی ہو رہی تھی۔ اس لئے بارکنا حولہ جتنا بیت المعمور پر صادق آتا ہے، اتنا کسی اور عمارت پر صادق نہیں آتا۔ یہ اور اس طرح کے

بعض شواہد بعض مصنفین نے بیان کئے ہیں، جنہوں نے حضرت امام جعفر صادقؒ کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔

کلامیات میں ایک اہم مضمون بشائر النبیین بھی ہے، مختلف انبیاء علیہم السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی بشارتیں دی ہیں، مختلف آسمانی کتابوں میں آپ کی آمد کے بارے میں اشارات پائے جاتے ہیں۔ جنہیں بہت سے لوگوں نے علیحدہ کتابوں میں جمع کیا ہے، بشائر النبیین کے نام سے کتابیں موجود ہیں، سیرت نگاروں نے ان کے حوالے دیئے ہیں، اُردو زبان میں بھی اس موضوع پر کتابیں موجود ہیں۔

کلامیاتِ سیرت پر اُردو زبان میں بہت سے مصنفین نے بہت اچھی کتابیں لکھی ہیں، غالباً سب سے زیادہ جامع بحث ہمارے برصغیر کے دو مصنفین نے کی ہے، مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے رحمۃ اللعالمین میں اور علامہ سید سلیمان ندویؒ نے سیرت النبی ﷺ میں۔

یہ وہ چند باتیں تھیں، جن کا تعلق سیرت اور علمِ کلام سے تھا۔ یہ سیرت و علمِ کلام کے مشترک مضامین ہیں۔ سیرت کے ان پہلوؤں کو سمجھنے کے لئے یہاں علمِ کلام کا مطالعہ ضروری ہے، اور علمِ کلام کے اس پہلو کو سمجھنے کے لئے سیرت کا مطالعہ ضروری ہے۔

حوالہ جات

۱۔ انوار اقبال/ اقبال اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۸ء

۲۔ المائدہ: ۶۷

۳۔ الاسرائی: ۱

۴۔ ابن قیم جوزیہ/ زاد المعاد: موسسۃ الرسالہ، بیروت ۱۹۸۷ء، ج ۳، ص ۴۰

۵۔ ایضاً

۶۔ الصف: ۹

۷۔ آل عمران: ۱۷۹

۸۔ الانعام: ۱۲۴

۹۔ مکتوبات/ ج ۱، ص ۹۵

۱۰۔ ج ۱، ص ۲۶۸

۱۱۔ العنکبوت: ۳۹

۱۲۔ الحدید: ۲۵

۱۳۔ العنکبوت: ۵۰

۱۴۔ العنکبوت: ۵۱

۱۵۔ الاسراء: ۱

۱۶۔ تفصیل سیرت شامی: ۲۔۳، سیرت ابن کثیر: ج ۲۔۳، ابن ہشام: ج ۲، فتح الباری: ص ۷۹۰ وغیرہ

۱۷۔ القمر: ۱، تفصیل: حلبی: ج ۸، ص ۴۹۱، الشفا: ج ۱، ۱۸۳، بخاری: ج ۲، ص ۲۲۲، شامی: ج ۹، ص ۴۳۰، عیون الاثر: ج ۱، ص ۲۰۷، فتح الباری:

ج ۷،ص ۴۲۵، زرقانی: ج ۵،ص ۱۰۸

۱۸ یونس: ۱۶

۱۹۔ یوسف: ۱۰۲

۲۰۔ ملاحظہ کیجئے تفسیر روح المعانی/ ج ۲۱،ص ۱۷، ۱۸۔ تفسیر ابن کثیر/ ج ۳،ص ۴۲۲، ۴۲۳

۲۱۔ حٰم السجدہ: ۱۳

۲۲۔ تفصیل کے لئے دیکھئے ابن ہشام/ ج ۲، ص ۳۵۔ البدایہ والنہایہ/ ج ۳،ص ۸۱، حلبی / ج ،،ص ۴۸۶۔ ۴۸۹، وغیرہ

۲۳۔ ابن سعد/ ج ۱،ص ۱۹۹۔ مزید تفصیل کے لئے: روض الانف/ ج ۴، ص ۶۷، سیرت حلبیہ/ ج ۳،ص ۲۹۱، زرقانی/ ج ۳،ص ۳۴۱

۲۴۔ بخاری/ ج ۲،ص ۲۱۲

۲۵۔ مستدرک/ ج ۳،ص ۶۱۸، ۶۲۸۷

۲۶۔ مسند امام احمد

۲۷۔ بخاری: ج ۲،ص ۱۸۸

۲۸۔ بخاری/ ج ۳،ص ۱۳۴۸، رقم ۳۴۸۳

۲۹۔ سیرت النبی/ ج ۳،ص ۳۴۳

۳۰۔ بخاری، کتاب الجہاد باب الرکوب علی الدابۃ الصبعۃ

۳۱۔ ملاحظہ کیجئے ابن ہشام/ ج ۴،ص ۱۷۹، تفسیر مظہری/ ج ۹،ص ۹

۳۲۔ زرقانی/ ج ۲،ص ۴۳

۳۳۔ مسند احمد/ ج ۳،ص ۳۱، رقم ۸۴۱۴ مسند احمد اس کا تذکرہ مختصر ہے

۳۴۔ بخاری/ ج ۴، ص ۸۶، ۸۷۔ بیہقی/ ج ۳، ص ۴۷۳

۳۵۔ بخاری/ ج ۳،ص ۲۲

۳۶۔ الاحزاب: ۵۳

۳۷۔ الاحزاب: ۵۱

۳۸۔ الاحزاب: ۵۲

۳۹۔ الاسراء: ۱

قرآن کریم کے مضامین کا سورت وار خلاصہ

مطالب القرآن

حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاںؒ

صرف 110 روپے منی آرڈر کے ذریعے ارسال فرما کر رجسٹرڈ ڈاک سے کتاب گھر بیٹھے حاصل کیجئے

زوّار اکیڈمی پبلی کیشنز

اے۔۴/ ۱۷، ناظم آباد نمبر ۴۔ کراچی۔ 74600، فون: 021-6684790

رسولِ اکرم ﷺ بحیثیتِ تاجر

مرتب

حافظ محمد عارف گھانچی

اہم مضامین: عہد رسالت کے بازار، شریک تجارت افراد، تجارتی اسفار، انداز تجارت، بطور تاجر اعلیٰ صفات، بازاروں کا قیام، تجارتی اصلاحات، تجارتی فیصلے، تاجروں سے خطاب، ہم عصر تاجر صحابہ۔

رسول اللہ ﷺ بحیثیت والد

مرتب

حافظ محمد عارف گھانچی

اہم مضامین: اولاد النبی ﷺ، بے مثال والد، صاحبزادیوں کی شادیاں، رسول اللہ ﷺ کے زیر سایہ بچے، پیارے رسول ﷺ کا بچوں سے پیار، نبی کریم ﷺ اور بچوں کی تربیت، رسول اللہ ﷺ کی والدین کو نصیحتیں

سیرت سید الکونین ﷺ

مصنفہ

حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب

نور اللہ مرقدہ

خطبات سیرت

مؤلف

ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمہ اللہ

باہتمام: حافظ محمد عارف گھانچی

۱۔ خوبصورت اور مضبوط جلد	۲۔ اعلیٰ ولایتی کاغذ
۳۔ کمپیوٹر کی عمدہ لکھائی	۴۔ بہترین چھپائی

ناشر

کتب خانہ سیرت

کھتری مسجد، لی مارکیٹ، کراچی، فون: 2541951، موبائل: 0321-2834249

تقسیم کار: مکتبہ فیض القرآن، ۱۲ قاسم سینٹر، اردو بازار، کراچی، فون: 2217776